Registered No. L. 5340

شعبان - ۱۳۶۷ھ

جلد ۳۱
عدد ۲

ماهنامه

ترجمان القرآن

علوم قرآنی وحقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ-لاہور

دستور ساز اسمبلی

سے

مسلمانانِ پاکستان کا مطالبہ

چونکہ پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتی ہے اور

چونکہ پاکستان کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی ساری جدوجہد اور قربانیاں صرف اس خاطر تھیں کہ وہ ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔

لہٰذا

اب قیامِ پاکستان کے بعد ہر پاکستانی مسلمان دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ کرتا ہے، کہ وہ اس بات کا اعلان کرے، کہ

۱۔ پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور حکومتِ پاکستان کی اس کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی اس کے ملک میں پوری کرے۔

۲۔ پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہے۔

۳۔ تمام وہ قوانین جو اسلامی شریعت کے خلاف اب تک جاری رہے ہیں منسوخ کئے جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کیا جائے گا جو شریعت کے خلاف پڑتا ہو۔

۴۔ حکومتِ پاکستان اپنے اختیارات ان حدود کے اندر استعمال کرے گی جو شریعت نے مقرر کر دیئے ہیں۔

فہرست مضامین

جلد ۳۱	شعبان ۱۳۶۷ھ مطابق جون ۱۹۴۸ء	عدد ۲

ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور میں طبع کرا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

نوٹ:- حضرت مولانا صاحب اور ناظرین کرام سے ہم معذرت خواہ ہیں کہ پرچہ ہذا کی طباعت بوجہ چند در چند خاص وجوہ ناتسلی بخش معرض وجود میں آئی۔ آئندہ انشاء اللہ تعالے عمدہ طباعت سے مزین ہو کر پیش خدمت ہوا کرے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

کامل ایک سال ملتوی رہنے کے بعد "ترجمان القرآن" کی اشاعت کا سلسلہ اب پھر شروع ہو رہا ہے۔ پچھلے سال آخری پرچہ رجب ۱۳۶۶ھ کا شائع ہوا تھا۔ پھر مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کے قومی اخراج کا تاریخی سانحہ پیش آگیا۔ ساری قوم کے ساتھ ہم کو بھی دارالاسلام (جمال پور پٹھان کوٹ) سے نکلنا پڑا۔ لاہور آنے کے بعد قانون کے مطابق رسالہ کا نیا ڈکلریشن داخل کرنا ضروری تھا، چنانچہ اس کی درخواست کر دی گئی۔ لیکن مغربی پنجاب کی حکومت نے کئی مہینہ تک ہماری درخواست منظور نہ کی۔ یہ وجوہ تھے جن کی بنا پر اتنی مدت تک یہ رسالہ شائع نہ ہو سکا۔ ہمیں امید ہے کہ ناظرین ترجمان القرآن ہماری ان مجبوریوں کو پیش نظر رکھ کر اس طویل التوا کو معاف فرمائیں گے۔

پچھلے سال ہماری آنکھوں نے جو ہولناک انقلاب دیکھا ہے اس نے تمام ان انقلابات کو مات کر دیا ہے جو اس سے پہلے نہ صرف ہمارے اس ملک میں بلکہ دنیا کے کسی ملک میں پیش آئے ہیں۔ ممکن ہے کہ انسانی جانوں کا اتلاف اس سے پہلے کبھی اس سے بھی زیادہ وسیع رقبہ میں ہوا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے پہلے کبھی اس سے زیادہ بڑی آبادیوں کو ان کے آبائی وطنوں سے اکھاڑ پھینکا گیا ہو۔ مگر شاید اس سے پہلے کبھی اور کہیں انسان نے انسان کے ساتھ اتنے بڑے پیمانے پر ایسی سنگ دلانہ درندگی اور ایسی بے شرمانہ بہیمیت کا برتاؤ نہیں کیا ہے۔ قوموں میں دشمنیاں بھی ہوئی ہیں، ملکوں میں خانہ جنگیاں بھی ہو چکی ہیں، لیکن غالباً کبھی دنیا کی دو قوموں کے درمیان عداوت نے یہ شدت، یہ

تلخی اور یہ تندی اختیار نہیں کی ہے۔ انسان انسان سے بارہا لڑا ہے، مگر لڑائی میں کمینہ پن اور بدمعاشی کا جو مظاہرہ یہاں ہوا ہے، یہ اپنی نظیر بس آپ ہی ہے۔ یہاں انسان صورت جانوروں نے وہ وہ کام کئے ہیں کہ اگر کتوں اور بھیڑیوں پر ان کا الزام تھوپ دیا جائے تو وہ بھی اسے اپنی توہین محسوس کریں۔ اور یہ کرتوت چند گنے چنے بدمعاشوں کے نہیں تھے بلکہ پوری پوری قوموں نے اپنے آپ کو بدمعاش ثابت کیا، باقاعدہ حکومتیں بدمعاش بن گئیں، بڑے بڑے لیڈروں اور رئیسوں اور وزیروں نے بدمعاشی کی اسکیم سوچی اور حکومتوں کے پورے نظم و نسق نے اپنے مجسٹریٹوں اور اپنی پولیس اور اپنی فوج کے ذریعہ سے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنایا۔ دو سال پہلے تک ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ جس ملک میں ہم رہتے ہیں اس کی آبادی کا اخلاقی زوال اس انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ نفیس لباسوں اعلیٰ ڈگریوں اور بڑے ناموں کے پردے میں جو شخصیتیں چھپی ہوئی تھیں ان کو ہم شرفا میں شمار کرتے تھے۔ عام آبادی کے پرامن رویے کو دیکھ کر ہم سمجھتے تھے کہ یہ بھلے انسانوں کی بستیاں ہیں۔ مگر افسوس کہ واقعات نے اس سارے حسن ظن کا پردہ چاک کر دیا۔ معلوم ہوا کہ پہلے جو کچھ ہم دیکھ رہے تھے وہ محض انگریز کی سنگین کا کرشمہ تھا۔ اس سنگین کے ہٹتے ہی یہ حقیقت کھل گئی کہ یہ ملک لاکھوں کروڑوں ڈاکوؤں، لٹیروں، قاتلوں، زانیوں اور سخت کمینہ صفت ظالموں سے بھرا پڑا تھا۔

کیا یہ سب کچھ جو واقع ہوا محض ایک اتفاقی حادثہ تھا؟ — جو لوگ پچھلے تیس سال سے اس ملک کی رہنمائی کرتے رہے ہیں، اور جن کی قیادت میں یہ انقلاب رونما ہوا ہے، وہ ایسا ہی کچھ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اس فساد عظیم کے اسباب کی بحث کو باتوں میں ٹالنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کی ایک شاعرانہ توجیہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ کشت و خون اور ظلم و ستم کا یہ مظاہرہ کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے جس پر کچھ فکرمند ہونے کی ضرورت ہو، یہ تو ایک آزاد قوم کی ولادت کے درد ہیں جو ایسے موقع پر ہوا ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ ولادت کے درد ہی تھے تو یہ دنیا کو ایک درندے کی پیدائش کی خوشخبری دے رہے تھے نہ کہ ایک انسان کے تولد کی۔ انہوں نے دنیا کو جو اطلاع دی

وہ اس بات کی نہ تھی کہ کچھ انسان ہیں جن کا بندِ اسیری ٹوٹتا ہے بلکہ دراصل یہ اس بات کی اطلاع تھی کہ کچھ بھیڑیے قید تھے جن کا پنجرہ کھل گیا ہے۔ اس کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستان کے باشندے اپنی فطرت اور اپنے مزاج ہی کے لحاظ سے کمینے، بدمعاش اور سفاک ہیں، یا ان کو ایسا بنا دیا گیا ہے؟ پہلا الزام ثابت کرنے کے لئے اس سے زیادہ قوی ثبوت کی ضرورت ہے جو پچھلے دو سال کے واقعات نے فراہم کیا ہے۔ آخر ہندوستانیوں کی پچھلی سینکڑوں برس کی تاریخ موجود ہے۔ اپنے ماضی میں انہوں نے کب ایسی ذلیل صفات کا مظاہرہ کیا تھا؟ پھر اگر یہ الزام ثابت نہیں ہے تو یقیناً دوسرا الزام آپ سے آپ ثابت ہے، یعنی یہ کہ ہمارے ملک کی آبادی کو اس اخلاقی پستی کے گڑھے میں گرایا گیا ہے۔ یہی وہ نتیجہ ہے جس سے بچنے کے لئے پچھلے دردناک واقعات کے اسباب کی بحث کو باتوں میں اڑانے کی کوشش کی جاتی ہے، کیونکہ یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلی ربع صدی میں ہمارے ملک کی سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے

ہندوستان میں سیاسی بیداری کی ابتدا مغربی تعلیم و تہذیب کے زیر اثر ہوئی۔ اس تعلیم اور تہذیب نے دو تحفے ہمارے ملک کے کارفرما دماغوں اور کارکن ہاتھوں کو دئے۔ ایک، قومیت کا احساس اور قوم پرستی کا جذبہ۔ دوسرے مادہ پرستانہ اخلاق۔

پہلی چیز کو لیکر یہاں کے سیاسی لیڈروں نے "ہندوستانی قومیت" کا ایک مصنوعی تخیل پیدا کرنے کی کوشش کی، مگر چونکہ اس کے لئے کوئی حقیقی بنیاد موجود نہ تھی اس لئے قومیت کی حس بیدار کرنے کی جتنی کوششیں کی گئیں ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں اُن مختلف گروہوں میں اپنی جداگانہ قومیتوں کا شعور جاگ اٹھا جو فی الحقیقت اپنے اندر قومیت کے فطری عناصر رکھتے تھے۔ اس طرح چالیس پچاس سال کی تبلیغ قومیت نے اس ملک میں ایک کے بجائے بہت سی چھوٹی بڑی قومیتیں پیدا کر دیں جن میں سے تین ——— یعنی ہندو قومیت، مسلم قومیت اور سکھ قومیت ——— تو پوری طرح برسرِکار آ کر اپنا کھیل کھیل چکی ہیں، اور باقی بہت سی صوبائی اور لسانی قومیتیں ابھی دوران

تخلیق میں ہیں۔ پھر سیاسی اختیارات حاصل کرنے کے لئے برطانوی اقتدار کے خلاف، جوں جوں جدوجہد ہو رہی تھی اس کا قدم جتنا جتنا آگے بڑھتا گیا، ان مختلف ذہنیتوں کے درمیان آپس کی کشمکش اتنی ہی تیز تر اور تلخ تر ہوتی چلی گئی۔ اس کشمکش نے ان میں سے ہر ایک کے اندر قوم پرستی کا شعلہ بھڑکا دیا اور ایک کی طرف سے دوسرے کے قومی حوصلوں کی مزاحمت جتنی بڑھتی اتنی ہی قومی عداوت ان کے درمیان بڑھتی چلی گئی۔

دوسری طرف مادہ پرستانہ اخلاق کا جو درس مغربی تعلیم و تہذیب سے لیا گیا تھا وہ باؤلے کتے کے زہر کی طرح سارے ملک کی رگ رگ میں پھیل گیا۔ اس نے دلوں کو خدا ترسی اور حق شناسی سے خالی کر دیا، شرافت اور انسانیت کی جڑیں ہلا دیں، اور ان تمام اخلاقی قدروں کو ختم کر دیا جو اس ملک کے لوگوں نے اپنے قدیم مذاہب سے پائی تھیں۔ یہ اس نئے اخلاق ہی کا کرشمہ تھا کہ پچھلے پچیس سال میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی قومی کشمکش روز بروز زیادہ سے زیادہ رذالت کے راستوں پر بڑھتی چلی گئی۔ بڑے بڑے لیڈروں نے بے حیائی کے ساتھ ایمان نگل نگل کر قومی خود غرضیوں کے تقاضے پورے کئے۔ بڑی بڑی ذمہ دار سیاسی جماعتوں نے حق اور انصاف سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ کئے۔ ملک بھر کے اخبارات نے انتہائی بے شرمی کے ساتھ جھوٹے پروپیگنڈے کئے، گالم گلوچ کا طوفان بپا کیا، اور نفرت و عداوت کی شراب پلا پلا کر اپنی اپنی قوموں کو بدمست کر دیا۔ پھر دونوں مخالف گروہوں کے افراد نے سرکاری محکموں میں، منڈیوں اور بازاروں میں، اور زندگی کے ہر کاروبار میں ایک دوسرے کے خلاف کھلی کھلی بے انصافیاں اور حق تلفیاں کیں اور ہر اس بے ایمانی کو اپنے لئے نیکی اور کار ثواب بنا لیا جو حریف قوم کے کسی فرد کے ساتھ کی جائے۔ واقعات کی یہ رفتار صاف بتا رہی تھی کہ اس ملک کا اخلاقی زوال کس پستی کی طرف بہا چلا جا رہا ہے۔

یہی وہ اسباب ہیں جنہوں نے مل جل کر وہ ہولناک نتائج پیدا کئے جو ہماری آنکھیں ابھی ابھی دیکھ چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری سے وہ لوگ بری نہیں ہو سکتے جو اس دور میں یہاں کی مختلف قوموں کے رہنما اور سربراہ کار رہے ہیں۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک طرف اپنی اپنی قوم کے لوگوں میں قومی خواہشات برانگیختہ کیں اور دوسری طرف قومی اخلاق کو سنبھالنے کے لئے کچھ نہ کیا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ اسے گرایا اور گرنے میں خود اس کی پیشوائی

لی۔ اگر یہ اس کھیل کے نتائج سے بے خبر تھے تو سخت اناڑی تھے۔ ایسے اناڑی اس قابل نہیں ہیں کہ کروڑوں انسانوں کی قسمتوں کے ساتھ بازی گری کرنے کے لئے انہیں چھوڑ دیا جائے۔ اور اگر انہوں نے جان بوجھ کر یہ سارا کھیل کھیلا تو در حقیقت یہ انسانیت کے اور خود اپنی قوم کے دشمن ہیں۔ ان کا صحیح مقام پیشوائی کی مسند پر نہیں بلکہ عدالت کا کٹہرا ہے جہاں ان کے اعمال کا محاسبہ ہونا چاہیئے۔

یہ خیال کرنا سخت حماقت ہے کہ جو کچھ ہو گذرا وہ اس قومی کشمکش کا آخری باب تھا اور یہ کہ اب تقسیم ملک کے بعد تاریخ ایک صحیح راستے پر چل پڑیگی۔ ہرگز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۵ اگست ۴۷ء کی تقسیم سے یہاں جو دو مملکتیں بنی ہیں، انہوں نے قومی خود غرضی اور اخلاقی پستی کا وہ سارا زہر میراث میں پایا ہے جو قبل تقسیم کے ہندوستان کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا۔ اور ان دونوں مملکتوں کی پیدائش کا آغاز جن بدبختانہ حالات میں ہوا ہے وہ ان کی آئندہ تاریخ پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نئی سیاسی سرحد کے دونوں جانب جو دو قومیں آباد ہیں ان کے دل ایک دوسرے کے خلاف انتقام اور عداوت کے تلخ ترین جذبات سے لبریز ہیں ــــــ خصوصاً سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان تو وہ دشمنی پیدا ہو چکی ہے جو شاید اس وقت کہیں بھی دنیا کی دو قوموں کے درمیان نہیں پائی جاتی ــــــ مسلمان ہندو اور سکھ ایک دوسرے کو وہ چرکے لگا چکے ہیں جن کے زخم مدتوں رستے رہینگے۔ اور اب وہ کسی غیر قوم کے ماتحت بے بس نہیں ہیں بلکہ اپنی اپنی آزاد مملکتیں رکھتے ہیں۔ اگر اب ان دونوں مملکتوں کے باشندوں کو ہوش نہ آیا، اگر اب بھی ان کی لیڈرشپ تبدیل نہ ہوئی اور اگر اس نئے دور میں بھی ان کے معاملات اسی اندھی اور گندی قوم پرستی پر اور اسی مادہ پرستانہ اخلاق پر چلتے رہے جس پر اب تک وہ چلے ہیں، تو آئندہ ان با اختیار قوموں کی کشمکش بہت زیادہ بڑے پیمانے پر بدرجہا زیادہ تلخ نتائج پیدا کریگی۔ پہلے جو گالم گلوچ اخباروں کے کالموں میں ہوتی تھی وہ اب بین الاقوامی پروپیگنڈے پر ہوگی۔ پہلے جو چھوٹے چھوٹے معرکے دفتروں اور منڈیوں میں برپا ہوا کرتے تھے اب وہ دو سلطنتوں کے درمیان سیاسی رسہ کشی اور معاشی رقابت کی شکل میں برپا ہونگے۔ اور پھر اگر خدانخواستہ ان دونوں قوموں کے درمیان کبھی جنگ ہو گئی تو یقیناً وہ ایسی سخت انتقامی جنگ ہوگی جو اپنی وحشت و بربریت

میں تاریخ انسانی کی بدترین لڑائیوں کو بھی مات کر دیگی۔

لہٰذا اب پاکستان اور ہندوستان دونوں کے مستقبل کی بہتری کا انحصار اس بات پر ہے کہ اگر ان کی آبادیوں میں شریف معقول اور خدا ترس انسانوں کا کوئی عنصر موجود ہے تو وہ منظم ہو کر اٹھے، اپنی اپنی قوم کی حیثیت بدلنے کی کوشش کرے، اور موجودہ قیادتوں کو بدل کر ایسے طریقے پر دونوں ملکوں کے معاملات چلائے جس سے ان کے تعلقات شریفانہ ہمسائگی اور منصفانہ تعاون پر قائم ہو سکیں۔

اب ذرا ایک نظر تقسیم کے اس ڈرامے پر بھی ڈال لیجیے جو پچھلے سال یہاں کھیلا گیا ہے، تاکہ آپ کو ان لیڈروں کی سیاسی دانائی کا حال معلوم ہو جائے جن کی مہارتِ فن کا شہرہ ایک مدت سے ہم سن رہے تھے۔ اس ڈرامے کے اصل اداکار تین تھے، انگریز، کانگریس، اور مسلم لیگ۔ ان تینوں کے کام کا جائزہ لیکر ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو کیا ثابت کیا ہے۔

انگریزوں کے لیے جنگ عظیم ملک کے پیدا کردہ مسائل اور ہندوستان کی سیاسی بیداری نے جو سوال پیدا کر دیا تھا وہ یہ تھا کہ آیا اس ملک پر آخر وقت تک قاہرانہ تسلط رکھا جائے یہاں تک کہ زبردستی نکالے جانے کی نوبت آجائے، یا وہ بوقت آنے سے پہلے ہی باہمی رضامندی سے یہ ملک چھوڑ دیا جائے۔ پہلی صورت میں وہ مزید چند سال تک اس ملک پر قبضہ رکھ سکتے تھے، مگر اس عارضی فائدے کا مستقل نقصان یہ تھا کہ زبردستی نکالے جانے کے بعد انہیں ان تمام فائدوں سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھولینا پڑتا جو ہندوستان سے اٹھائے جا سکتے تھے۔ دوسری صورت میں برٹش امپائر کا بظاہر خاتمہ تھا، مگر آزاد ہندوستان سے فائدہ اٹھانے کے امکانات باقی رہتے تھے۔ ان دونوں صورتوں کے فوائد اور نقصانات کا موازنہ کر کے انگریزی قوم نے ٹھنڈے دل سے دوسری صورت کو انتخاب کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ تاریخ اور نفسیات کے اس سبق سے بھی غافل نہ تھی کہ جو قوم کسی دوسری قوم کی غلامی سے آزاد ہوتی ہے اس کے اندر مدتوں تک اس قوم کے خلاف شدید تعصب بلکہ انتقام کا جذبہ بھڑکتا رہتا ہے جو اس پر جبر و قہر سے حکومت کرتی رہی ہو، اس لیے

اپنے مفاد کی خاطر یہ ضروری سمجھتی تھی کہ ہندوستان کا معاملہ ایسے طریقہ سے طے کیا جائے جس سے تعصب، انتقام کے وہ سارے جذبات جو اس کے خلاف بھڑک سکتے تھے خود ہندوستانیوں کے درمیان آپس میں ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو جائیں اور انگریز دونوں کا یارِ غار بن کر رہے۔ اس غرض کے لئے برطانوی حکومت نے پہلے لارڈ ویول کو استعمال کرنا چاہا، مگر معلوم نہیں کہ وہ چالاک کم تھا یا شریف زیادہ، بہرحال وہ تاریخِ انسانی کی عظیم ترین سیاسی بدمعاشی کا وہ کام انجام نہ دے سکا جو اسکی قومی حکومت اس سے لینا چاہتی تھی۔ آخرکار نگاہِ انتخاب لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر جاکر ٹھہری اور اس شخص نے آکر تقسیمِ ہند کا پورا نقشہ ایسے طرز پر بنایا جو لازمی اور قطعی طور پر وہی نتائج پیدا کر سکتا تھا جو اس نے فی الواقع پیدا کیے۔ کلکتہ، نواکھالی، بہار، گڑھ مکتیشور، راولپنڈی اور امرتسر کے واقعات کے بعد تقسیمِ ملک اور انتقالِ اختیارات کا جو ڈھنگ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اختیار کیا اس کو دیکھ کر ایک معمولی عقل و بصیرت رکھنے والا آدمی بھی یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس سے ملک کے ایک بڑے حصے میں سخت خونریزی ہو کر رہے گی۔ اب اگر یہ ماؤنٹ بیٹن کا اناڑی پن تھا اور کوئی دانستہ چالاکی نہ تھی جسے اسکی قوم کی رضامندی حاصل ہوتی، تو جو ہولناک نتائج اس سے برآمد ہوئے انہیں دیکھ لینے کے بعد بجائے اسکے کہ اس شخص پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے جاتے، اس پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ ہونی چاہیئے تھی اور لاکھوں انسانوں کے قتل اور ایک کروڑ سے زیادہ انسانوں کی خانہ بربادی کے بدلے میں اس پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن اس کی سیاست دانی کی جو داد انگلستان میں دی گئی وہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ یہ سب کچھ دانستہ کیا گیا تھا اور اسے پوری انگریزی قوم کی رضامندی حاصل تھی۔ آج یہ اسی چالاکی کا کرشمہ ہے کہ ہندو اور مسلمان اور سکھ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں، اور وہ انگریز جو کل تک تینوں پر یکساں ظلم کر رہا تھا تینوں کا مشترک دوست ہے۔ مسلمان کے لئے ہندوستان کی اور ہندو اور سکھ کے لئے پاکستان کی زمین تنگ ہے مگر انگریز کے لئے ہر جگہ فراخی ہی فراخی ہے۔ انسانیت کے نقطۂ نظر سے آپ چاہے اسکو کتنا ہی بڑا جرم قرار دے لیں، انگریز کی قومی خودغرضی کے لحاظ سے یہ بالیقین ایک کامیاب ترین سیاسی چال تھی۔ مگر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس پر زیادہ داد کا مستحق کون ہے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن یا ہندوستان کے وہ اندھے سیاسی لیڈر جو تقسیم کے اس نقشے کی ساخت اور تکمیل میں ہر مرحلے پر اس کے شریک کار رہے!

باقی صفحہ ۷ پر دیکھیں

اسلام کا نظامِ حیات

[یہ ایک سلسلۂ تقاریر ہے جو ۶ جنوری سے ۱۶ مارچ ۴۸ء تک مختلف تاریخوں میں ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کیا گیا تھا۔ اس میں اسلامی نظامِ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

اگرچہ وقت کی اس مختصر تقریر میں کسی موضوع کا بھی پورا پورا حق ادا نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس مجموعہ کا اتنا فائدہ ضرور ہے کہ اس میں بیک نگاہ اسلامی زندگی کا ایک جامع نقشہ آدمی کے سامنے آجاتا ہے۔ جن مقامات پر مزید بحث تشنہ رہ گئی ہے وہاں توضیحِ مدعا کے لئے ہم نے ضروری حواشی کا اضافہ کردیا ہے اور بعض مواقع پر حاشیہ میں حوالے بھی درج کر دیے ہیں تاکہ لوگوں کو وہ سند معلوم ہوجائے جس سے کوئی بات اخذ کی گئی ہے۔ یہ حواشی نشر نہیں کئے گئے تھے بلکہ یہ بعد کا اضافہ ہیں۔

ہم ریڈیو پاکستان کے شکر گزار ہیں کہ اس نے یہ تقریریں شائع کرنے کی ہمیں اجازت مرحمت فرمائی۔]

۱- اخلاقی نظام

انسان کے اندر اخلاقی حس ایک فطری حس ہے جو بعض صفات کو پسند اور بعض دوسری صفات کو ناپسند کرتی ہے۔ یہ حس انفرادی طور پر اشخاص میں چاہے کم و بیش ہو مگر مجموعی طور پر انسانیت کے شعور نے اخلاق کے بعض اوصاف پر خوبی کا اور بعض پر برائی کا ہمیشہ یکساں حکم لگایا ہے۔ سچائی، انصاف، پاسِ عہد اور امانت کو ہمیشہ سے انسانی اخلاقیات میں تعریف کا مستحق سمجھا گیا ہے، اور کبھی کوئی ایسا دور نہیں گزرا جب جھوٹ، ظلم، بدعہدی اور خیانت کو پسند کیا گیا ہو۔ ہمدردی، رحم، فیاضی اور فراخدلی کی ہمیشہ قدر کی گئی ہے

اور خود غرضی، سنگ دلی، بخل اور تنگ نظری کو کبھی عزت کا مقام حاصل نہیں ہوا۔ صبر و تحمل، استقلال، بردباری، اولوالعزمی و شجاعت ہمیشہ سے وہ اوصاف رہے ہیں جو داد کے مستحق سمجھے گئے، اور بے صبری، بچھورپن، تلون مزاجی، پست حوصلگی اور بزدلی پر کبھی تحسین و آفرین کے پھول نہیں برسائے گئے۔ ضبط نفس، خودداری، شائستگی اور ملنساری کا شمار ہمیشہ سے خوبیوں ہی میں ہوتا رہا، اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کمینگی نفس، کم ظرفی، بدتمیزی اور کج خلقی نے اخلاقی محاسن کی فہرست میں جگہ پائی ہو۔ فرض شناسی، وفا شعاری، مستعدی اور احساس ذمہ داری کی ہمیشہ عزت کی گئی، اور نا فرض شناس، بے وفا، کام چور اور غیر ذمہ دار لوگوں کو کبھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ اسی طرح اجتماعی زندگی کے اچھے اور برے اوصاف کے معاملہ میں بھی انسانیت کا فیصلہ تقریباً متفق علیہ ہی رہا ہے۔ قدر کی مستحق ہمیشہ وہی سوسائٹی رہی ہے جس میں نظم اور انضباط ہو، تعاون اور امداد باہمی ہو، آپس کی محبت اور خیر خواہی ہو، اجتماعی انصاف اور معاشرتی برابری ہو۔ تفرقہ، انتشار، بدنظمی، بے ضابطگی، نااتفاقی، آپس کی بدخواہی، ظلم اور ناہمواری کو اجتماعی زندگی کے محاسن میں کبھی شمار نہیں کیا گیا۔ ایسا ہی معاملہ کردار کی نیکی اور بدی کا بھی ہے۔ چوری، زنا، قتل، ڈاکہ، جعل سازی اور رشوت خواری کبھی اچھے افعال نہیں سمجھے گئے۔ بدزبانی، مردم آزاری، غیبت، چغل خوری، حسد، بہتان تراشی اور فساد انگیزی کو کبھی نیکی نہیں سمجھا گیا۔ مکار، متکبر، ریاکار، منافق، ہٹ دھرم اور حریص لوگ کبھی بھلے آدمیوں میں شمار نہیں کیے گئے۔ اس کے برعکس والدین کی خدمت، رشتہ داروں کی مدد، ہمسایوں سے حسن سلوک، دوستوں سے رفاقت، کمزوروں کی حمایت، یتیموں اور بے کسوں کی خبرگیری، مریضوں کی تیمارداری اور مصیبت زدہ لوگوں کی اعانت ہمیشہ نیکی سمجھی گئی ہے۔ پاک دامن، خوش گفتار، نرم مزاج اور خیر اندیش لوگ ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔ انسانیت اپنا اچھا عنصر انہی لوگوں کو سمجھتی رہی ہے جو راستباز اور کھرے ہوں، جن پر ہر معاملہ میں اعتبار کیا جا سکے، جن کا ظاہر و باطن یکساں اور قول و فعل مطابق ہو، جو اپنے حق پر قانع اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں فراخ دل ہوں، جو امن سے رہیں اور دوسروں کو امن دیں، جن کی ذات سے ہر ایک کو خیر کی امید ہو اور کسی کو برائی کا اندیشہ نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی اخلاقیات دراصل وہ عالمگیر حقیقتیں ہیں جن کو سب انسان جانتے

ہیں اور ہمیشہ سے جانتے چلے آرہے ہیں۔ نیکی اور بدی کوئی چھپی ہوئی چیزیں نہیں ہیں کہ ان کو کہیں سے ڈھونڈ کر نکالنے کی ضرورت ہو۔ وہ تو انسانیت کی جانی پہچانی چیزیں ہیں جن کا شعور آدمی کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید اپنی زبان میں نیکی کو معروف اور بدی کو منکر کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے، یعنی نیکی وہ چیز ہے جسے سب انسان بھلا جانتے ہیں، اور منکر وہ جسے کوئی خوبی اور بھلائی کی حیثیت سے نہیں جانتا۔ اسی حقیقت کو قرآن دوسرے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے کہ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا یعنی نفسِ انسانی کو خدا نے برائی اور بھلائی کی واقفیت الہامی طور پر عطا کر رکھی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر اخلاق کی برائی اور بھلائی جانی پہچانی چیزیں ہیں اور دنیا ہمیشہ سے بعض صفات کے نیک اور بعض کے بد ہونے پر متفق رہی ہے تو پھر دنیا میں یہ مختلف اخلاقی نظام کیسے ہیں؟ ان کے درمیان فرق کس بنا پر ہے؟ کیا چیز ہے جس کے باعث ہم کہتے ہیں کہ اسلام اپنا ایک مستقل اخلاقی نظام رکھتا ہے؟ اور اخلاق کے معاملہ میں آخر اسلام کا وہ خاص عطیہ کیا ہے جسے اس کی امتیازی خصوصیت کہا جا سکے؟

اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے جب ہم دنیا کے مختلف اخلاقی نظاموں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پہلی نظر میں جو فرق ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ مختلف اخلاقی صفات کو زندگی کے مجموعی نظام میں سمونے اور ان کی حد، ان کا مقام اور ان کا مصرف تجویز کرنے، اور ان کے درمیان تناسب قائم کرنے میں یہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پھر زیادہ گہری نگاہ سے دیکھنے پر اس فرق کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ در اصل وہ اخلاقی حسن و قبح کا معیار تجویز کرنے، اور خیر و شر کے علم کا ذریعہ متعین کرنے میں مختلف ہیں اور ان کے درمیان اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ قانونِ اخلاق کے پیچھے وہ قوتِ نافذہ کونسی ہے جس کے زور سے وہ جاری ہو، اور وہ کیا محرکات ہیں جو انسان کو اس قانون کی پابندی پر آمادہ کریں۔ لیکن جب ہم اس اختلاف کے اسباب کا کھوج لگاتے ہیں تو آخر کار یہ حقیقت ہم پر کھلتی ہے کہ وہ اصلی چیز جس نے ان سب اخلاقی نظاموں کے راستے الگ کر دیے ہیں یہ ہے کہ ان کے درمیان کائنات

کے تصورِ کائنات کے اندر انسان کی حیثیت اور انسانی زندگی کے مقصد میں اختلاف ہے، اور اسی اختلاف نے جڑ سے لیکر شاخوں تک ان کی روح ان کے مزاج اور ان کی شکل کو ایک دوسرے سے بالکل مختلف کر دیا ہے۔ انسان کی زندگی میں اصل فیصلہ کن سوالات یہ ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خدا ہے یا نہیں؟ ہے تو وہ ایک ہے یا بہت سے ہیں؟ جس کی خدائی بھی مانی جائے اس کی صفات کیا ہیں؟ ہمارے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے؟ اس نے ہماری رہنمائی کا کوئی انتظام کیا ہے یا نہیں؟ ہم اس کے سامنے جواب دہ ہیں یا نہیں؟ جواب دہ ہیں تو کس چیز کی ہمیں جواب دہی کرنی ہے؟ اور ہماری زندگی کا مقصد اور انجام کیا ہے جسے پیش نظر رکھ کر ہم کام کریں؟ ان سوالات کا جواب جس نوعیت کا ہوگا اسی کے مطابق نظام زندگی بنے گا اور اس کے مناسبِ حال نظامِ اخلاق تیار ہوگا۔

اس مختصر گفتگو میں میرے لئے یہ مشکل ہے کہ میں دنیا کے مختلف نظامہائے حیات کا جائزہ لے کر بتاؤں کہ ان میں سے کس کس نے ان سوالات کا کونسا جواب اختیار کیا ہے اور اس جواب نے اس کی شکل اور راستے کے تعین پر کیا اثر ڈالا ہے۔ میں صرف اسلام کے متعلق عرض کروں گا کہ وہ ان سوالات کا کیا جواب اختیار کرتا ہے اور اس کی بنا پر کس مخصوص قسم کا نظامِ اخلاق وجود میں آتا ہے۔

اسلام کا جواب یہ ہے کہ اس کائنات کا خدا ہے اور وہ ایک ہی خدا ہے۔ اسی نے اسے پیدا کیا ہے، وہی اس کا لاشریک مالک، حاکم اور پروردگار ہے، اور اسی کی اطاعت پر یہ سارا نظام چل رہا ہے۔ وہ حکیم ہے، قادرِ مطلق ہے، کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے، سبوح و قدوس ہے (یعنی عیب، خطا، کمزوری اور نقص سے پاک ہے)، اور اس کی خدائی ایسے طریقے پر قائم ہے جس میں لاگ لپیٹ اور ٹیڑھ نہیں ہے۔

انسان اس کا پیدائشی بندہ ہے۔ اس کا کام یہی ہے کہ اپنے خالق کی بندگی و اطاعت کرے۔ اس کی زندگی کے لئے کوئی صورت بجز اس کے صحیح نہیں ہے کہ وہ سراسر خدا کی بندگی ہو۔ اس بندگی کا طریقہ تجویز کرنا انسان کا اپنا کام نہیں ہے بلکہ یہ اس خدا کا کام ہے جس کا وہ بندہ ہے۔ خدا نے اس کی رہنمائی کے لئے پیغمبر بھیجے ہیں اور کتابیں نازل کی ہیں۔ انسان کا فرض ہے کہ اپنی زندگی کا نظام اسی سرچشمہ ہدایت سے اخذ کرے۔ انسان اپنی زندگی کے پورے کارنامے کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہے،

اور یہ جواب دہی اُسے اِس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں کرنی ہے۔ دنیا کی موجودہ زندگی دراصل امتحان کی مہلت ہے اور یہاں انسان کی تمام سعی و کوشش اِس مقصد پر مرکوز ہونی چاہیئے کہ وہ آخرت کی جوابدہی میں اپنے خدا کے حضور کامیاب ہو۔ اس امتحان میں انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ شریک ہے۔ اس کی تمام قوتوں اور قابلیتوں کا امتحان ہے۔ زندگی کے ہر پہلو کا امتحان ہے۔ پوری کائنات میں جس جس چیز سے جیسا کچھ بھی اس کو سابقہ پیش آتا ہے اس کی بے لاگ جانچ ہونی ہے کہ انسان نے اس کے ساتھ کیسا معاملہ کیا۔ اور یہ جانچ وہ ہستی کرنے والی ہے جس نے زمین کے ذرّوں پر ہوا اور پانی پر، کائناتی لہروں پر اور خود انسان کے اپنے دل و دماغ اور دست و پا پر اس کی حرکات و سکنات ہی کا نہیں بلکہ اس کے خیالات اور ارادوں تک کا ٹھیک ٹھیک ریکارڈ مہیا کر رکھا ہے۔

یہ ہے وہ جواب جو اسلام نے زندگی کے بنیادی سوالات کا دیا ہے۔ یہ تصورِ کائنات و انسان اُس اصلی اور انتہائی بھلائی کو متعین کر دیتا ہے جس کو پہنچنا انسانی سعی و عمل کا مقصود ہونا چاہیئے اور وہ ہے خدا کی رضا۔ یہی وہ معیار ہے جس پر اسلام کے اخلاقی نظام میں کسی طرزِ عمل کو پرکھ کر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ خیر ہے یا شر۔ اِس کے تعین سے اخلاق کو وہ محور مل جاتا ہے جس کے گرد پوری اخلاقی زندگی گھومتی ہے اور اس کی حالت بے لنگر کے جہاز کی سی نہیں رہتی کہ ہوا کے جھونکے اور سمندر کے تھپیڑے اسے ہر طرف دوڑاتے پھریں۔ یہ تعین ایک مرکزی مقصد سامنے رکھ دیتا ہے جس کے لحاظ سے زندگی میں تمام اخلاقی صفات کی متناسب حدیں، مناسب جگہیں اور مناسب عملی صورتیں مقرر ہو جاتی ہیں، اور ہمیں وہ مستقل اخلاقی قدریں ہاتھ لگ جاتی ہیں جو تمام بدلتے ہوئے حالات میں اپنی جگہ ثابت و قائم رہ سکیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رضائے الٰہی کے مقصود قرار پا جانے سے اخلاق کو ایک بلند ترین غایت مل جاتی ہے جس کی بدولت اخلاقی ارتقاء کے امکانات لامتناہی ہو سکتے ہیں اور کسی مرحلہ پر بھی اغراض پرستی کی آلائشیں اس کو ملوث نہیں کر سکتیں۔

معیار دینے کے ساتھ اسلام اپنے اِسی تصورِ کائنات و انسان سے ہم کو اخلاقی حسن و قبح کے علم کا ایک مستقل ذریعہ بھی دیتا ہے۔ اس نے ہمارے اخلاقی علم کو محض عقل، یا خواہشات، یا تجربے، یا

علوم انسانی پر منحصر نہیں کر دیا ہے کہ ہمیشہ ان کے بدلتے ہوئے فیصلوں سے ہمارے اخلاقی احکام بھی بدلتے رہیں اور انہیں کوئی پائیداری نصیب نہ ہو سکے، بلکہ وہ ہمیں ایک متعین ماخذ دیتا ہے) یعنی خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت) جس سے ہم کو ہر حال اور ہر زمانے میں اخلاقی ہدایات ملتی ہیں، اور یہ ہدایات ایسی ہیں کہ خانگی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بین الاقوامی سیاست کے بڑے سے بڑے مسائل تک زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں وہ ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ ان کے اندر معاملات زندگی پر اخلاق کے اصولوں کا وہ وسیع ترین انطباق پایا جاتا ہے جو کسی مرحلے پر کسی دوسرے ذریعہ علم کی احتیاج ہمیں محسوس نہیں ہونے دیتا۔

پھر اسلام کے اسی تصور کائنات وانسان میں وہ قوت نافذہ بھی موجود ہے جس کا قانون اخلاق کی پشت پر ہونا ضروری ہے، اور وہ ہے خدا کا خوف، آخرت کی باز پرس کا اندیشہ اور ابدی مستقبل کی خرابی کا خطرہ۔ اگرچہ اسلام ایک ایسی طاقتور رائے عام بھی تیار کرنا چاہتا ہے جو اجتماعی زندگی میں اشخاص اور گروہوں کو اصول اخلاق کی پابندی پر مجبور کرنے والی ہو، اور ایک ایسا سیاسی نظام بھی بنانا چاہتا ہے جس کا اقتدار اخلاقی قانون کو بزور نافذ کرے، لیکن اس کا اصل اعتماد اس خارجی دباؤ پر نہیں ہے، بلکہ اس اندرونی دباؤ پر ہے جو خدا اور آخرت کے عقیدہ میں مضمر ہے اخلاقی احکام دینے سے پہلے اسلام آدمی کے دل میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ تیرا معاملہ دراصل اس خدا کے ساتھ ہے جو ہر وقت ہر جگہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ تو دنیا بھر سے چھپ سکتا ہے مگر اس سے نہیں چھپ سکتا۔ دنیا بھر کو دھوکا دے سکتا ہے مگر اسے نہیں دے سکتا۔ دنیا بھر سے بھاگ سکتا ہے مگر اس کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ دنیا محض تیرے ظاہر کو دیکھتی ہے مگر وہ تیری نیتوں اور ارادوں تک کو دیکھ لیتا ہے۔ دنیا کی تھوڑی سی زندگی میں تو چاہے کچھ کر لے، بہرحال ایک دن تجھے مرنا ہے اور اس عدالت میں حاضر ہونا ہے جہاں وکالت، رشوت، سفارش، جھوٹی شہادت، دھوکا اور فریب، کچھ نہ چل سکے گا اور تیرے مستقبل کا بے لاگ فیصلہ ہو جائیگا۔ یہ عقیدہ بٹھا کر اسلام گویا ہر آدمی کے دل میں پولیس کی ایک چوکی بٹھا دیتا ہے جو اندر سے اس کو احکام کی تعمیل پر مجبور کرتی ہے،

خواہ باہر ان احکام کی پابندی کرانے والی کوئی پولیس، عدالت اور جیل موجود ہو یا نہ ہو۔ اسلام کے "قانونِ اخلاق" کی پشت پر اصل زور یہی ہے جو اسے نافذ کراتا ہے۔ رائے عام اور حکومت کی طاقت اس کی تائید میں موجود ہو تو "نور" علی نور، ورنہ تنہا یہی ایمان مسلمان افراد اور مسلمان قوم کو سیدھا چلا سکتا ہے بشرطیکہ واقعی ایمان دلوں میں جاگزیں ہو۔

اسلام کا یہ تصورِ کائنات و انسان وہ محرکات بھی فراہم کرتا ہے جو انسان کو قانونِ اخلاق کے مطابق عمل کرنے کے لئے ابھارتے ہیں۔ انسان کا اس بات پر راضی ہو جانا کہ وہ خدا کو اپنا خدا مانے اور اس کی بندگی کو اپنی زندگی کا طریقہ بنا لے، اور اس کی رضا کو اپنا مقصدِ زندگی ٹھہرا لے، یہ اس بات کے لئے کافی محرک ہے کہ وہ اُن احکام کی اطاعت کرے جن کے متعلق اسے یقین ہو کہ وہ خدا کے احکام ہیں۔ اس محرک کے ساتھ آخرت کا یہ عقیدہ بھی ایک دوسرا طاقتور محرک ہے کہ جو شخص احکامِ الٰہی کی اطاعت کرے گا اس کے لئے ابدی زندگی میں ایک شاندار مستقبل یقینی ہے خواہ دنیا کی اس عارضی زندگی میں اسے کتنی ہی مشکلات، نقصانات اور تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑے، اور اس کے برعکس جو یہاں سے خدا کی نافرمانیاں کرتا ہوا جائیگا اسے ابدی سزا بھگتنی پڑے گی چاہے دنیا کی اس چند روزہ زندگی میں وہ کیسے ہی مزے لوٹ لے۔ یہ امید اور یہ خوف اگر کسی کے دل میں جاگزیں ہو تو اس میں اتنی زبردست قوتِ محرکہ موجود ہے کہ وہ ایسے مواقع پر بھی اسے نیکی پر ابھار سکتی ہے جہاں نیکی کا نتیجہ دنیا میں سخت نقصان دہ نکلتا نظر آتا ہو، اور اُن مواقع پر بھی بدی سے دور رکھ سکتی ہے جہاں بدی نہایت پر لطف یا نفع بخش ہو۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اپنا تصورِ کائنات، اپنا معیارِ خیر و شر، اپنا ماخذِ علمِ اخلاق، اپنی قوتِ نافذہ اور اپنی قوتِ محرکہ الگ رکھتا ہے اور انہی چیزوں کے ذریعہ سے معروف اخلاقیات کے مواد کو اپنی قدروں کے مطابق ترتیب دے کر زندگی کے تمام شعبوں میں انہیں جاری کرتا ہے۔ اسی بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلام اپنا ایک مکمل اور مستقل بالذات اخلاقی نظام رکھتا ہے۔

اس نظام کی امتیازی خصوصیات یوں تو بہت سی ہیں مگر ان میں سے تین سب سے زیادہ نمایاں ہیں جنہیں اس کا خاص نقطہ کہا جا سکتا ہے۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رضائے الٰہی کو مقصود بنا کر اخلاق کے لئے ایک ایسا بلند معیار فراہم کرتا ہے جس کی وجہ سے اخلاقی ارتقاء کے امکانات کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ ایک ماخذِ علم مقرر کر کے اخلاق کو وہ پائیداری اور استقلال بخشتا ہے جس میں ترقی کی گنجائش تو ہے مگر تلون اور نیرنگی کی گنجائش نہیں ہے۔ خوف خدا کے ذریعہ سے اخلاق کو وہ قوت نافذہ دیتا ہے جو خارجی دباؤ کے بغیر انسان سے اس کی پابندی کراتی ہے، اور خدا اور آخرت کے عقیدے سے وہ قوت محرکہ فراہم کرتا ہے جو انسان کے اندر خود بخود قانونِ اخلاق پر عمل کرنے کی رغبت اور آمادگی پیدا کرتی ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ کی اپچ سے کام لے کر کچھ نرالے اخلاقیات پیش نہیں کرتا اور نہ انسان کے معروف اخلاقیات میں سے بعض کو گھٹانے اور بعض کو بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ انہی اخلاقیات کو لیتا ہے جو معروف ہیں، اور ان میں سے چند کو نہیں بلکہ سب کو لیتا ہے، پھر زندگی میں پورے توازن اور تناسب کے ساتھ ایک ایک کا محل، مقام اور مصرف تجویز کرتا ہے، اور ان کے انطباق کو اتنی وسعت دیتا ہے کہ انفرادی کردار، خانگی معاشرت، شہری زندگی، ملکی سیاست، معاشی کاروبار، منڈی، بازار، مدرسہ، عدالت، پولیس لائن، چھاؤنی، میدان جنگ، صلح کانفرنس، غرض زندگی کا کوئی پہلو اور شعبہ ایسا نہیں رہ جاتا جو اخلاق کے ہمہ گیر اثر سے بچ جائے۔ ہر جگہ، ہر شعبۂ زندگی میں وہ اخلاق کو حکمراں بناتا ہے، اور اس کی کوشش یہ ہے کہ معاملاتِ زندگی کی باگیں خواہشات، اغراض اور مصلحتوں کے بجائے، اخلاق کے ہاتھ میں ہوں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانیت سے ایک ایسے نظام زندگی کا مطالبہ کرتا ہے جو معروف پر قائم اور منکرات سے پاک ہو۔ اس کی دعوت یہی ہے کہ جن بھلائیوں کو انسانیت کے ضمیر نے ہمیشہ بھلا جانا ہے، آؤ انہیں قائم کریں اور پروان چڑھائیں، اور جن برائیوں کو انسانیت ہمیشہ سے برا سمجھتی آئی ہے آؤ انہیں دبائیں اور مٹائیں۔ اس دعوت پر جنہوں نے لبیک کہا انہی کو جمع کر کے اسلام نے ایک

امت بنائی جس کا نام مسلم تھا، اور ان کو ایک امت بنانے سے اس کی واحد غرض یہی تھی کہ وہ معروف کو جاری و قائم کرنے اور منکر کو دبانے اور مٹانے کے لیے منظم سعی کرے۔ اب اگر اسی امت کے ہاتھوں معروف دبے اور منکر قائم ہونے لگے تو یہ ماتم کی جگہ ہے، خود اس امت کے لیے بھی اور دنیا کے لیے بھی۔

۲۔ سیاسی نظام

اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد تین اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ توحید، رسالت اور خلافت۔ ان اصولوں کو اچھی طرح سمجھے بغیر اسلامی سیاست کے تفصیلی نظام کو سمجھنا مشکل ہے۔ اس لیے سب سے پہلے میں انہی کی مختصر تشریح کرونگا۔

توحید کے معنی یہ ہیں کہ خدا اس دنیا کا اور اس کے سب رہنے والوں کا تنہا خالق، پروردگار اور مالک ہے، حکومت اور فرمانروائی اسی کی ہے، وہی حکم دینے اور منع کرنے کا حق رکھتا ہے، اور بندگی و اطاعت بلا شرکت غیرے اسی کے لیے ہے۔ ہماری یہ ہستی جس کی بدولت ہم موجود ہیں، ہمارے یہ جسمانی آلات اور طاقتیں جن سے ہم کام لیتے ہیں، ہمارے وہ اختیارات جو ہمیں دنیا کی موجودات پر حاصل ہیں، اور خود یہ موجودات جن پر ہم اپنے اختیارات استعمال کرتے ہیں، ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہماری اپنی پیدا کردہ یا حاصل کردہ ہے اور نہ اس کی بخشش میں خدا کے ساتھ کوئی دوسرا شریک ہے۔ اس لیے اپنی ہستی کا مقصد اور اپنی قوتوں کا مصرف اور اپنے اختیارات کی حدود متعین کرنا نہ تو ہمارا اپنا کام ہے اور نہ کسی دوسرے کو اس معاملہ میں دخل دینے کا کوئی حق ہے۔ یہ صرف اس خدا کا کام ہے جس نے ہم کو ان قوتوں اور اختیارات کے ساتھ پیدا کیا ہے اور دنیا کی یہ بہت سی چیزیں ہمارے تصرف میں دی ہیں۔ توحید کا یہ اصول انسانی حاکمیت کی سرے سے نفی کر دیتا ہے۔ ایک انسان ہو یا ایک خاندان، یا ایک طبقہ اور گروہ، یا ایک پوری قوم، یا مجموعی طور پر تمام دنیا کے انسان، حاکمیت کا حق بہرحال کسی کو بھی نہیں پہنچتا۔ حاکم صرف خدا ہے اور اسی کا حکم قانون ہے۔

خدا کا قانون جس ذریعہ سے بندوں کو پہنچتا ہے اس کا نام رسالت ہے۔ اس ذریعہ سے ہمیں دو چیزیں ملتی ہیں۔ ایک کتاب جس میں خدا نے خود اپنا قانون بیان کیا ہے۔ دوسرے کتاب کی مستند تشریح جو رسول خدا کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اپنے قول اور عمل میں پیش کی ہے۔ خدا کی کتاب میں وہ تمام اصول بیان کر دیئے گئے ہیں جن پر انسانی زندگی کا نظام قائم ہونا چاہیئے۔ اور رسول نے کتاب کے اس منشا کے مطابق عملاً ایک نظام زندگی بنا کر، چلا کر، اور اس کی ضروری تفصیلات بتا کر ہمارے لئے ایک نمونہ قائم کر دیا ہے۔ انہی دونوں چیزوں کے مجموعے کا نام اسلامی اصطلاح میں شریعت ہے، اور یہی وہ اساسی دستور ہے جس پر اسلامی ریاست قائم ہوتی ہے۔

اب خلافت کو لیجئے۔ یہ لفظ عربی زبان میں نیابت کے لئے بولا جاتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا میں انسان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ زمین پر خدا کا نائب ہے، یعنی اس کے ملک میں اس کے دیئے ہوئے اختیارات استعمال کرتا ہے۔ آپ جب کسی شخص کو اپنی جائداد کا انتظام سپرد کرتے ہیں تو لازماً آپ کے پیش نظر چار باتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ جائداد کے اصل مالک آپ خود ہیں نہ کہ وہ شخص۔ دوسرے یہ کہ اس شخص کو آپ کی جائداد میں آپ کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق کام کرنا چاہیئے۔ تیسرے یہ کہ اُسے اپنے اختیارات کو اُن حدود کے اندر استعمال کرنا چاہیئے جو آپ نے اس کے لئے مقرر کر دی ہوں۔ چوتھے یہ کہ آپ کی جائداد میں اُسے آپ کا منشا پورا کرنا ہوگا نہ کہ اپنا۔ یہ چار شرطیں نیابت کے تصور میں اس طرح شامل ہیں کہ نائب کا لفظ بولتے ہی خود بخود انسان کے ذہن میں آجاتی ہیں۔ اگر کوئی نائب ان چار شرطوں کو پورا نہ کرے تو آپ کہیں گے کہ وہ نیابت کی حدود سے تجاوز کر گیا اور اس نے وہ معاہدہ توڑ دیا جو نیابت کے عین مفہوم میں شامل تھا۔ ٹھیک یہی معنی ہیں جن میں اسلام انسان کو خدا کا خلیفہ قرار دیتا ہے اور اس خلافت کے تصور میں بھی یہی چاروں شرطیں شامل ہیں۔ اسلامی نظریۂ سیاسی کی رو سے جو ریا قائم ہوگی وہ دراصل خدا کی حاکمیت کے تحت انسانی خلافت ہوگی جسے خدا کے ملک میں ا ی ہوئی ہدایات کے مطابق اس کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر کام کر کے اس کا منشا پورا کرنا ہے۔

خلافت کی اس تشریح کے سلسلہ میں اتنی بات اور سمجھ لیجئے کہ اس معنی میں اسلامی نظریۂ سیاسی کسی ایک شخص یا خاندان یا طبقے کو خلیفہ قرار نہیں دیتا بلکہ اُس پوری سوسائٹی کو خلافت کا منصب سونپتا ہے جو توحید اور رسالت کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کر کے نیابت کی شرطیں پوری کرنے پر آمادہ ہو۔ ایسی سوسائٹی بحیثیت مجموعی خلافت کی حامل ہے اور یہ خلافت اس کے ہر فرد کو پہنچتی ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے اسلام میں جمہوریت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرہ کا ہر فردِ خلافت کے حقوق اور اختیارات رکھتا ہے۔ ان حقوق اور اختیارات میں تمام افراد بالکل برابر کے حصہ دار ہیں۔ کسی کو کسی پر نہ تو ترجیح حاصل ہے اور نہ یہی حق پہنچتا ہے کہ دوسرے کو ان حقوق اور اختیارات سے محروم کر سکے۔ ریاست کا نظم و نسق چلانے کے لئے جو حکومت بنائی جائیگی وہ انہی افراد کی مرضی سے بنیگی۔ یہی لوگ اپنے اختیاراتِ خلافت کا ایک حصہ اُسے سونپینگے۔ اس کے بننے میں ان کی رائے شامل ہوگی، اور ان کے مشورے ہی سے وہ چلیگی۔ جو ان کا اعتماد حاصل کر لیگا وہ ان کی طرف سے خلافت کے فرائض انجام دےگا اور جو ان کا اعتماد کھو دیگا اسے حکومت کے منصب سے ہٹنا پڑیگا۔ اس لحاظ سے اسلامی جمہوریت ایک مکمل جمہوریت ہے، اتنی ہی مکمل جتنی کوئی جمہوریت ہو سکتی ہے۔ البتہ جو چیز اسلامی جمہوریت کو مغربی جمہوریت سے اصولاً الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کا نظریۂ سیاسی جمہوری حاکمیت کا قائل ہے اور اسلام جمہوری خلافت کا۔ وہاں جمہور خود بادشاہ ہیں۔ یہاں بادشاہی خدا کی ہے اور جمہور اس کے خلیفہ ہیں۔ وہاں اپنی شریعت جمہور آپ بناتے ہیں۔ یہاں ان کو اُس شریعت کی پابندی کرنی ہوتی ہے جو خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ سے دی ہے۔ وہاں حکومت کا کام جمہور کا منشا پورا کرنا ہوتا ہے۔ یہاں حکومت اور اس کے بنانے والے جمہور سب کا کام خدا کا منشا پورا کرنا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ مغربی جمہوریت ایک مطلق العنان خدائی ہے جو اپنے اختیارات کو آزادانہ استعمال کرتی ہے۔ اور اس کے برعکس اسلامی جمہوریت ایک پابندِ آئین بندگی ہے جو اپنے اختیارات کو خدا کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق اُس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرتی ہے۔

اب میں آپ کے سامنے اُس ریاست کا ایک مختصر مگر واضح نقشہ پیش کروں گا جو توحید، رسالت اور خلافت کے اِن بنیادی اصولوں پر مبنی ہے۔

اس ریاست کا مقصد قرآن میں صاف طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اُن بھلائیوں کو قائم کرے، فروغ دے اور پروان چڑھائے جن سے خداوند عالم انسانی زندگی کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے، اور اُن برائیوں کو روکے، دبائے اور مٹائے جن کا وجود انسانی زندگی میں خداوند عالم کو پسند نہیں ہے۔ اسلام میں ریاست کا مقصد نہ محض انتظام ملکی ہے اور نہ یہ کہ وہ کسی خاص قوم کی اجتماعی خواہشات کو پورا کرے۔ اس کے بجائے اسلام اس کے سامنے ایک بلند نصب العین رکھ دیتا ہے جس کے حصول میں اسے اپنے تمام وسائل و ذرائع اور اپنی تمام طاقتیں صرف کرنی چاہئیں، اور وہ یہ ہے کہ خدا اپنی زمین میں اور اپنے بندوں کی زندگی میں جو پاکیزگی، جو حسن، جو خیر و صلاح، اور جو ترقی و فلاح دیکھنا چاہتا ہے وہ رونما ہو اور بگاڑ کی اُن تمام صورتوں کا سدباب ہو جو خدا کے نزدیک اس کی زمین کو اجاڑنے والی اور اس کے بندوں کی زندگی کو خراب کرنے والی ہیں۔ اس نصب العین کو پیش کرنے کے ساتھ اسلام ہمارے سامنے خیر اور شر دونوں کی ایک واضح تصویر رکھتا ہے جس میں مطلوبہ بھلائیوں اور ناپسندیدہ برائیوں کو صاف صاف نمایاں کر دیا گیا ہے۔ اس تصویر کو نگاہ میں رکھ کر ہر زمانے اور ہر ماحول میں اسلامی ریاست اپنا اصلاحی پروگرام بنا سکتی ہے۔

اسلام کا مستقل تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اخلاقی اصولوں کی پابندی کی جائے، اسلئے وہ اپنی ریاست کے لئے بھی یہ قطعی پالیسی معین کر دیتا ہے کہ اس کی سیاست بے لاگ انصاف، بےلوث سچائی، اور کھری ایمانداری پر قائم ہو۔ وہ ملکی یا انتظامی یا قومی مصلحتوں کی خاطر جھوٹ، فریب اور بے انصافی کو کسی حال میں گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ملک کے اندر راعی اور رعایا کے باہمی معاملات ہوں یا ملک کے باہر دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات، دونوں میں وہ صداقت، دیانت اور انصاف کو اغراض و مصالح پر مقدم رکھنا چاہتا ہے۔ مسلمان افراد کی طرح مسلم ریاست پر بھی وہ یہ پابندی عائد کرتا ہے کہ عہد کرو تو اسے وفا کرو، لینے اور دینے کے پیمانے یکساں رکھو، جو کچھ کہتے ہو وہی کرو اور جو کچھ کرتے

ہو وہی کہو۔ اپنے حق کے ساتھ اپنے فرض کو بھی یاد رکھو اور دوسرے کے فرض کے۔ اُن کے حق کو بھی نہ بھولو، طاقت کو ظلم کے بجائے انصاف کے قیام کا ذریعہ بنا، حق کو بہر حال حق سمجھو اور اسے ادا کرو۔ اقتدار کو خدا کی امانت سمجھو اور اس یقین کے ساتھ اسے استعمال کرو کہ اس امانت کا پورا حساب تمہیں اپنے خدا کو دینا ہے۔

اسلامی ریاست اگرچہ زمین کے کسی خاص خطے ہی میں قائم ہوتی ہے مگر وہ نہ انسانی حقوق کو ایک جغرافی حد میں محدود رکھتی ہے اور نہ شہریت کے حقوق کو۔ جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے اسلام ہر انسان کے لیے چند بنیادی حقوق مقرر کرتا ہے اور ہر حال میں ان کے احترام کا حکم دیتا ہے خواہ وہ انسان اسلامی ریاست کے حدود میں رہتا ہو یا اس کے باہر، خواہ وہ دوست ہو یا دشمن، خواہ ہم سے صلح رکھتا ہو یا برسرِ جنگ۔ انسانی خون ہر حال میں محترم ہے اور حق کے بغیر اسے نہیں بہایا جا سکتا۔ عورت، بچے، بوڑھے، بیمار اور زخمی پر دست درازی کرنا کسی حال میں جائز نہیں۔ عورت کی عصمت بہر حال احترام کی مستحق ہے اور اسے بے آبرو نہیں کیا جا سکتا۔ بھوکا آدمی روٹی کا، ننگا آدمی کپڑے کا اور زخمی یا بیمار آدمی علاج و تیمارداری کا بہر حال مستحق ہے خواہ وہ دشمن قوم ہی سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ اور ایسے ہی چند دوسرے حقوق اسلام نے انسان کو بحیثیت انسان ہونے کے عطا کیے ہیں اور اسلامی ریاست کے دستور میں ان کو بنیادی حقوق کی جگہ حاصل ہے۔ رہے شہریت کے حقوق تو وہ بھی اسلام صرف انہی لوگوں کو نہیں دیتا جو اس کی ریاست کے حدود میں پیدا ہوئے ہوں، بلکہ ہر مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں پیدا ہوا ہو، اسلامی ریاست کے حدود میں داخل ہوتے ہی آپ سے آپ اس کا شہری بن جاتا ہے اور پیدائشی شہریوں کے برابر حقوق کا مستحق قرار پاتا ہے۔ دنیا میں جتنی اسلامی ریاستیں بھی ہوں گی ان سب کے درمیان شہریت مشترک ہوگی۔ مسلمان کو کسی اسلامی ریاست کے حدود میں داخل ہونے کے لیے پاسپورٹ کی ضرورت نہ ہوگی۔ مسلمان کسی نسلی، قومی یا طبقاتی امتیاز کے بغیر ہر اسلامی ریاست میں بڑے سے بڑے ذمہ داری کے منصب کا اہل ہو سکتا ہے۔

غیر مسلموں کے لئے جو کسی اسلامی ریاست کی حدود میں رہتے ہوں، اسلام نے چند حقوق معین کر دیئے ہیں اور وہ لازماً دستورِ اسلامی کا جزء ہوں گے۔ اسلامی اصطلاح میں ایسے غیر مسلم کو ذمی کہا جاتا ہے، یعنی جس کی حفاظت کا اسلامی ریاست نے ذمہ لیا ہے۔ ذمی کی جان، مال اور آبرو بالکل مسلمان کی جان و مال اور آبرو کی طرح محترم ہے۔ فوجداری اور دیوانی قوانین میں مسلم اور ذمی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ ذمیوں کے پرسنل لا میں اسلامی ریاست کوئی مداخلت نہ کرے گی۔ ذمیوں کو ضمیر و اعتقاد اور مذہبی رسوم و عبادات میں پوری آزادی حاصل ہو گی۔ ذمی اپنے مذہب کی تبلیغ ہی نہیں بلکہ قانون کی حد میں رہتے ہوئے اسلام پر تنقید بھی کر سکتا ہے[1]۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے حقوق اسلامی دستور میں غیر مسلم رعایا کو دیئے گئے ہیں اور یہ مستقل حقوق ہیں جنہیں اس وقت تک سلب نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ ہمارے ذمہ سے خارج نہ ہو جائیں۔ کوئی غیر مسلم حکومت اپنی مسلمان رعایا پر چاہے کتنے ہی ظلم ڈھائے، ایک اسلامی ریاست کے لئے اس کے جواب میں اپنی غیر مسلم رعایا پر شریعت کے خلاف ذرا سی دست درازی کرنا بھی جائز نہیں، حتیٰ کہ ہماری سرحد کے باہر چاہے تمام مسلمان قتل کر دیئے جائیں، ہم اپنی حد کے اندر ایک ذمی کا خون بھی قانونی حق کے بغیر نہیں بہا سکتے۔

اسلامی ریاست کے انتظام کی ذمہ داری ایک امیر کے سپرد کی جائے گی جسے صدر جمہوریہ کے مماثل سمجھنا چاہیئے۔ امیر کے انتخاب میں تمام اُن بالغ مردوں اور عورتوں کو رائے دینے کا حق حاصل ہو گا جو دستور کے اصولوں کو تسلیم کرتے ہوں۔ انتخاب کی بنیاد یہ ہو گی کہ روحِ اسلام کی واقفیت

---

[1] اس مسئلے پر تفصیلی بحث میں نے اپنے مضمون "اسلام میں مرتد کا حکم" میں کی ہے۔ یہاں صرف اتنی بات سمجھ لینی چاہیئے کہ اسلامی دستور میں غیر مسلموں کو تبلیغ اور تنقید کا جو حق دیا گیا ہے وہ غیر محدود نہیں ہے بلکہ اُن حدود کے اندر مقید ہے جو قوانینِ ملکی میں اس کے لئے مقرر کی گئی ہوں۔ بہرحال ایک ذمی کا یہ حق ناقابلِ انکار ہے کہ وہ معقول طریقے سے اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرے یا اُن وجوہ کا اظہار کرے جن کی بنا پر وہ اسلام کو اپنا دین بنانے کے لئے تیار نہیں ہے۔

اسلامی سیرت، خدا ترسی اور تدبر کے اعتبار سے کون شخص سوسائٹی کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کا اعتماد رکھتا ہے۔ ایسے ہی شخص کو امارت کے لئے منتخب کیا جائیگا۔ پھر اس کی مدد کے لئے ایک مجلس شوریٰ بنائی جائیگی اور وہ بھی لوگوں کی منتخب کردہ ہوگی۔ امیر کے لئے لازم ہوگا کہ ملک کا انتظام اہل شوریٰ کے مشورہ سے کرے۔ ایک امیر اسی وقت تک حکمراں رہ سکتا ہے جب تک اسے لوگوں کا اعتماد حاصل رہے۔ عدم اعتماد کی صورت میں اسے جگہ خالی کرنی ہوگی۔ مگر جب تک وہ لوگوں کا اعتماد رکھتا ہے اسے حکومت کے پورے اختیارات حاصل رہینگے اور وہ شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا استعمال کر سکے گا۔ امیر اور اس کی حکومت پر عام شہریوں کو نکتہ چینی کا پورا حق حاصل ہوگا۔

اسلامی ریاست میں قانون سازی ان حدود کے اندر ہوگی جو شریعت میں مقرر کی گئی ہیں۔ خدا اور رسول کے واضح احکام صرف اطاعت کے لئے ہیں، کوئی مجلس قانون ساز ان میں ردوبدل نہیں کر سکتی۔ رہے وہ احکام جن میں دو یا زائد تعبیریں ممکن ہیں، تو ان میں شریعت کا منشا معلوم کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو شریعت کا علم رکھتے ہوں۔ اس لئے ایسے معاملات مجلس شوریٰ کی اس سب کمیٹی کے سپرد کئے جائینگے جو علماء پر مشتمل ہوگی۔ اس کے بعد ایک وسیع میدان ان معاملات کا ہے جن میں شریعت نے کوئی حکم نہیں دیا ہے۔ ایسے تمام معاملات میں مجلس شوریٰ قوانین بنانے کے لئے آزاد ہے۔

اسلام میں عدالت انتظامی حکومت کے ماتحت نہیں ہے بلکہ براہ راست خدا کی نمائندہ اور اس کو جوابدہ ہے۔ اگرچہ حاکمانِ عدالت کو مقرر تو انتظامی حکومت ہی کریگی، مگر جب ایک شخص عدالت کی کرسی پر بیٹھ جائیگا تو وہ خدا کے قانون کے مطابق لوگوں کے درمیان بے لاگ انصاف کریگا اور اس کے انصاف کی زد سے خود حکومت بھی نہ بچ سکیگی حتیٰ کہ حکومت کے رئیس اعلیٰ کو بھی مدعی یا مدعا علیہ کی حیثیت سے اس کے سامنے اسی طرح حاضر ہونا پڑیگا جیسے ایک عام شہری حاضر ہوتا ہے۔

۲۔ معاشرتی نظام

اسلام کے معاشرتی نظام کا سنگ بنیاد یہ نظریہ ہے کہ دنیا کے سب انسان ایک نسل سے ہیں۔ خدا نے سب سے پہلے ایک انسانی جوڑا پیدا کیا تھا، پھر اسی جوڑے سے وہ سارے لوگ پیدا ہوئے جو دنیا میں آباد ہیں۔ ابتدا میں ایک مدت تک اس جوڑے کی اولاد ایک ہی امت بنی رہی۔ ایک ہی اس کا دین تھا۔ ایک ہی اس کی زبان تھی۔ کوئی اختلاف اس کے درمیان نہ تھا۔ مگر جوں جوں ان کی تعداد بڑھتی گئی، وہ زمین پر پھیلتے چلے گئے اور اس پھیلاؤ کی وجہ سے قدرتی طور پر مختلف نسلوں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان کی زبانیں الگ ہو گئیں، لباس الگ ہو گئے، رہن سہن کے طریقے الگ ہو گئے، اور جگہ جگہ کی آب و ہوا نے ان کے رنگ روپ اور خدوخال تک بدل دیے۔ یہ سب اختلافات فطری اختلافات ہیں۔ واقعات کی دنیا میں موجود ہیں۔ اس لئے اسلام ان کو بطور ایک واقعہ کے تسلیم کرتا ہے۔ وہ ان کو مٹانا نہیں چاہتا، بلکہ ان کا یہ فائدہ مانتا ہے کہ انسانوں کا باہمی تعارف اور تعاون اسی صورت سے ممکن ہے۔ لیکن ان اختلافات کی بنا پر انسانوں میں نسل، رنگ، زبان، قومیت، اور وطنیت کے جو تعصبات پیدا ہو گئے ہیں ان سب کو اسلام غلط قرار دیتا ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان اونچ نیچ، شریف اور کمین، اپنے اور غیر کے جتنے فرق پیدائش کی بنیاد پر کر لیے گئے ہیں، اسلام کے نزدیک یہ سب جاہلیت کی باتیں ہیں۔ وہ تمام دنیا کے انسانوں سے کہتا ہے کہ تم سب ایک ماں اور ایک باپ کی اولاد ہو، لہٰذا ایک دوسرے کے بھائی ہو، اور انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہو۔

انسانیت کا یہ تصور اختیار کرنے کے بعد اسلام کہتا ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان اصلی فرق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ رنگ، نسل، وطن اور زبان کا نہیں بلکہ خیالات، اخلاق اور اصولوں کا ہو سکتا ہے۔ ایک ماں کے دو بچے اپنے نسب کے لحاظ سے چاہے ایک ہوں، لیکن اگر ان کے خیالات اور اخلاق ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو زندگی میں دونوں کی راہیں الگ ہو جائینگی۔ اس کے برعکس مشرق اور مغرب کے انتہائی فاصلے پر رہنے والے دو انسان اگرچہ ظاہر میں کتنے ہی ایک دوسرے سے دور ہوں،

لیکن اگر ان کے خیالات متفق ہیں اور اخلاق ملتے جلتے ہیں تو ان کی زندگی کا راستہ ایک ہوگا۔ اس نظریہ کی بنیاد پر اسلام دنیا کے تمام نسلی، وطنی اور قومی معاشروں کے برعکس ایک فکری، اخلاقی اور اصولی معاشرہ تعمیر کرتا ہے جس میں انسان اور انسان کے ملنے کی بنیاد اس کی پیدائش نہیں بلکہ ایک عقیدہ اور ایک اخلاقی ضابطہ ہے۔ ہر وہ شخص جو ایک خدا کو اپنا مالک و معبود مانے، اور پیغمبروں کی لائی ہوئی ہدایت کو اپنا قانونِ زندگی تسلیم کرے، اس معاشرے میں شامل ہو سکتا ہے خواہ وہ افریقہ کا رہنے والا ہو یا امریکہ کا، خواہ وہ سامی نسل کا ہو یا آریہ نسل کا، خواہ وہ کالا ہو یا گورا، خواہ وہ ہندی بولتا ہو یا عربی۔ جو انسان بھی اس معاشرے میں شامل ہوں گے ان سب کے حقوق اور معاشرتی مرتبے یکساں ہوں گے۔ کسی قسم کے نسلی، قومی یا طبقاتی امتیازات ان کے درمیان نہ ہوں گے۔ کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہ ہوگا۔ کوئی چھوت چھات ان میں نہ ہوگی۔ کسی کا ہاتھ لگنے سے کوئی ناپاک نہ ہوگا۔ شادی بیاہ اور کھانے پینے اور مجلسی میل جول میں ان کے درمیان کسی قسم کی رکاوٹیں نہ ہوں گی۔ کوئی اپنی پیدائش یا اپنے پیشے کے لحاظ سے ذلیل یا کمین نہ ہوگا۔ کسی کو اپنی ذات برادری یا حسب نسب کی بنا پر مخصوص حقوق حاصل نہ ہو سکیں گے۔ آدمی کی بزرگی اس کے خاندان یا اس کے مال کی وجہ سے نہ ہو بلکہ صرف اس وجہ سے ہوگی کہ اس کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں اور وہ خدا ترسی میں دوسروں سے بڑھا ہوا ہے۔

یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جو نسل و رنگ اور زبان کی حدبندیوں اور جغرافی سرحدوں کو توڑ کر روئے زمین کے تمام خطوں پر پھیل سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر انسانوں کی ایک عالمگیر برادری قائم ہو سکتی ہے۔ نسلی اور وطنی معاشروں میں تو صرف وہ لوگ شامل ہو سکتے ہیں جو کسی نسل یا وطن میں پیدا ہوئے ہوں۔ اس سے باہر کے لوگوں پر ایسے ہر معاشرے کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ مگر اس فکری اور اصولی معاشرے میں ہر وہ شخص برابر کے حقوق کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے جو ایک عقیدے اور ایک اخلاقی ضابطے کو تسلیم کر لے۔ رہے وہ لوگ جو اس عقیدے اور ضابطے کو نہ مانیں تو یہ معاشرہ انہیں اپنے دائرے میں تو نہیں لیتا مگر انسانی برادری کا تعلق ان کے ساتھ قائم

کرنے اور انسانیت کے حقوق انہیں دینے کے لئے تیار ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ماں کے دو بچے اگر خیالات میں مختلف ہیں تو ان کے طریق زندگی بہر حال الگ ہونگے، مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے بھائی نہیں رہے۔ بالکل اسی طرح نسل انسانی کے دو گروہ، یا ایک ملک میں رہنے والے لوگوں کے دو گروہ بھی اگر عقیدے اور اصول میں اختلاف رکھتے ہیں تو ان کے معاشرے یقیناً الگ ہونگے، مگر انسانیت بہر حال ان میں مشترک رہیگی۔ اس مشترک انسانیت کی بنا پر زیادہ سے زیادہ جن حقوق کا تصور کیا جا سکتا ہے وہ سب اسلامی معاشرے نے غیر اسلامی معاشروں کے لئے تسلیم کئے ہیں۔

اسلامی نظام معاشرت کی ان بنیادوں کو سمجھ لینے کے بعد آیئے اب ہم دیکھیں کہ وہ کیا اصول اور طریقے ہیں جو اسلام نے انسانی میل ملاپ کی مختلف صورتوں کے لئے مقرر کئے ہیں۔

انسانی معاشرت کا اولین اور بنیادی ادارہ خاندان ہے۔ خاندان کی بنا ایک مرد اور ایک عورت کے ملنے سے پڑتی ہے۔ اس ملاپ سے ایک نئی نسل وجود میں آتی ہے۔ پھر اس سے رشتے اور کنبے اور برادری کے دوسرے تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ اور بالآخر یہی چیز پھیلتے پھیلتے ایک وسیع معاشرے تک جا پہنچتی ہے۔ پھر خاندان ہی وہ ادارہ ہے جس میں ایک نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو انسانی تمدن کی خدمات سنبھالنے کے لئے نہایت محبت، ایثار، دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تیار کرتی ہے۔ یہ ادارہ تمدن انسانی کے بقا اور نشو و نما کے لئے صرف رنگروٹ ہی بھرتی نہیں کرتا بلکہ اس کے کارکن دل سے اس بات کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ ان کی جگہ لینے والے خود ان سے بہتر ہوں اس بنا پر یہ ایک حقیقت ہے کہ خاندان ہی انسانی تمدن کی جڑ ہے اور اس جڑ کی صحت و طاقت پر خود تمدن کی صحت و طاقت کا مدار ہے۔ اسی لئے اسلام معاشرتی مسائل میں سب سے پہلے اس امر کی طرف توجہ کرتا ہے کہ خاندان کے ادارہ کو صحیح ترین اور مضبوط ترین بنیادوں پر قائم کیا جائے۔

اسلام کے نزدیک مرد اور عورت کے تعلق کی صحیح صورت صرف وہ ہے جس کے ساتھ معاشرتی ذمہ داریاں قبول کی گئی ہوں اور جس کے نتیجہ میں ایک خاندان کی بنا پڑے۔ آزادانہ اور غیر ذمہ دارانہ

تعلق کو وہ محض ایک معصوم سی تفریح یا ایک معمولی سی بے راہ روی سمجھ کر ٹال نہیں دیتا بلکہ اس کی نگاہ میں یہ انسانی تمدن کی جڑ کاٹ دینے والا فعل ہے، اس لئے ایسے تعلق کو وہ حرام اور قانونی جرم قرار دیتا ہے، اس کے لئے سخت سزا تجویز کرتا ہے تاکہ سوسائٹی میں ایسے تمدن کش تعلقات رائج نہ ہونے پائیں، اور معاشرت کو ان اسباب سے پاک کر دینا چاہتا ہے جو اس غیر ذمہ دارانہ تعلق کے لئے محرک ہوتے ہوں یا اس کے مواقع پیدا کرتے ہوں۔ پردے کے احکام، مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول کی ممانعت، موسیقی اور تصاویر پر پابندیاں، اور فواحش کی اشاعت کے خلاف رکاوٹیں سب اسی چیز کی روک تھام کے لئے ہیں اور ان کا مرکزی مقصد خاندان کے ادارے کو محفوظ اور مضبوط کرنا ہے۔ دوسری طرف ذمہ دارانہ تعلق یعنی نکاح کو اسلام محض جائز ہی نہیں رکھتا بلکہ اسے ایک نیکی، ایک کارِ ثواب، ایک عبادت قرار دیتا ہے۔ سن بلوغ کے بعد مرد اور عورت کے مجرد رہنے کو ناپسند کرتا ہے۔ ہر نوجوان کو اس بات پر اکساتا ہے کہ تمدن کی جن ذمہ داریوں کا بار اس کے ماں باپ نے اٹھایا تھا اپنی باری آنے پر وہ بھی انہیں اٹھائے۔ اسلام رہبانیت کو نیکی نہیں سمجھتا بلکہ اسے فطرت اللہ کے خلاف ایک بدعت ٹھہراتا ہے۔ وہ ان تمام رسموں اور رواجوں کو بھی سخت ناپسند کرتا ہے جن کی وجہ سے نکاح ایک مشکل اور بھاری کام بن جاتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ معاشرہ میں نکاح کو آسان ترین اور زنا کو مشکل ترین فعل ہونا چاہیے نہ یہ کہ نکاح مشکل اور زنا آسان ہو۔ اسی لئے اس نے چند مخصوص رشتوں کو حرام ٹھہرانے کے بعد تمام دور و نزدیک کے رشتہ داروں میں ازدواجی تعلق کو جائز کر دیا ہے، ذات برادری کی تفریقیں اٹھا کر تمام مسلمانوں میں آپس کے شادی بیاہ کی کھلی اجازت دی ہے، مہر اور جہیز اس قدر ہلکے رکھنے کا حکم دیا ہے جنہیں فریقین بآسانی برداشت کر سکیں اور رسم نکاح ادا کرنے کے لئے کسی قاضی، پنڈت، پروہت یا دفتر رجسٹری کی کوئی ضرورت نہیں رکھی۔ اسلامی معاشرہ کا نکاح ایک ایسی سادہ سی رسم ہے جو ہر کہیں دو گواہوں کے رامنے بالغ زوجین کے ایجاب و قبول سے انجام پا سکتی ہے، مگر یہ ضروری ہے کہ یہ ایجاب و قبول خفیہ نہ ہو بلکہ بستی میں اعلان کے ساتھ ہو۔

خاندان کے اندر اسلام نے مرد کو ناظم کی حیثیت دی ہے تاکہ وہ اپنے گھر میں ضبط قائم رکھے۔ بیوی کو شوہر کی اور اولاد کو ماں اور باپ دونوں کی اطاعت و خدمت کا حکم دیا ہے۔ ایسے ڈھیلے ڈھالے خاندانی نظام کو اسلام پسند نہیں کرتا جس میں کوئی انضباط نہ ہو اور گھر والوں کے اخلاق و معاملات درست رکھنے کا کوئی بھی ذمہ دار نہ ہو۔ نظم بہرحال ایک ذمہ دار ناظم ہی سے قائم ہو سکتا ہے۔ اور اسلام کے نزدیک اس ذمہ داری کے لئے خاندان کا باپ ہی فطرۃً موزوں ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مرد کو گھر کا ایک جابر و قاہر فرمانروا بنا دیا گیا ہے اور عورت ایک بے بس لونڈی کی حیثیت سے اس کے حوالہ کر دی گئی ہے۔ اسلام کے نزدیک ازدواجی زندگی کی اصل روح محبت اور رحمت ہے۔ عورت کا فرض اگر شوہر کی اطاعت ہے تو مرد کا بھی یہ فرض ہے کہ اپنے اختیارات کو اصلاح کے لئے استعمال کرے نہ کہ زیادتی کے لئے۔ اسلام ایک ازدواجی تعلق کو اسی وقت تک باقی رکھنا چاہتا ہے جب تک اس میں محبت کی شیرینی یا کم از کم رفاقت کا امکان باقی ہو۔ جہاں یہ امکان باقی نہ رہے وہاں وہ مرد کو طلاق کا اور عورت کو خلع کا حق دیتا ہے، اور بعض صورتوں میں اسلامی عدالت کو یہ اختیارات عطا کرتا ہے کہ وہ ایسے نکاح کو توڑ دے جو رحمت کے بجائے زحمت بن گیا ہو۔

خاندان کے محدود دائرے سے باہر قریب ترین سرحد رشتہ داری کی ہے جس کا دائرہ کافی وسیع ہوتا ہے۔ جو لوگ ماں اور باپ کے تعلق سے، یا بھائی اور بہنوں کے تعلق سے، یا سسرالی تعلق سے ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوں، اسلام ان سب کو ایک دوسرے کا ہمدرد، مددگار اور غمگسار دیکھنا چاہتا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ ذوی القربیٰ یعنی رشتہ داروں سے نیک سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث میں صلہ رحمی کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسے بڑی نیکی شمار کیا گیا ہے۔ وہ شخص اسلام کی نگاہ میں سخت ناپسندیدہ ہے جو اپنے رشتہ داروں سے سرد مہری اور طوطا چشمی کا معاملہ کرے۔ مگر اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ رشتہ داروں کی بے جا طرفداری کوئی اسلامی کام ہے۔ اپنے کنبے قبیلے کی ایسی حمایت جو حق کے خلاف ہو اسلام کے نزدیک جاہلیت ہے۔ اسی طرح اگر حکومت کا کوئی افسر پبلک کے خرچ پر اقرباپروری کرنے لگے یا اپنے عزیزوں کے ساتھ بے جا رعایت

کرنے لگے تو یہ بھی کوئی اسلامی کام نہیں ہے بلکہ ایک شیطانی حرکت ہے۔ اسلام جس صلۂ رحمی کا حکم دیتا ہے وہ اپنی ذات سے ہونی چاہیئے اور حق و انصاف کی حد کے اندر ہونی چاہیئے۔

رشتہ داری کے تعلق کے بعد دوسرا قریب ترین تعلق ہمسائگی کا ہے۔ قرآن کی رو سے ہمسایوں[۱] کی تین قسمیں ہیں۔ ایک رشتہ دار ہمسایہ۔ دوسرا اجنبی ہمسایہ۔ تیسرا وہ عارضی ہمسایہ جس کے پاس بیٹھنے یا ساتھ چلنے کا آدمی کو اتفاق ہو۔ یہ سب اسلامی احکام کی رو سے رفاقت، ہمدردی اور نیک سلوک کے مستحق ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے ہمسائے کے حقوق کی اتنی تاکید کی گئی کہ میں خیال کرنے لگا کہ شاید اب اسے وراثت میں حصہ دار بنا دیا جائے گا[۲]۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا وہ شخص مومن نہیں ہے جس کا ہمسایہ اس کی شرارتوں سے امن میں نہ ہو[۳]۔ ایک دوسری حدیث میں آپ کا ارشاد ہے کہ وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا رہ جائے[۴]۔ ایک مرتبہ آنحضرت سے عرض کیا گیا کہ ایک عورت بہت نمازیں پڑھتی ہے، اکثر روزے رکھتی ہے، خوب خیرات کرتی ہے، مگر اس کی بدزبانی سے اس کے پڑوسی عاجز ہیں۔ آپ نے فرمایا وہ دوزخی ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ ایک دوسری عورت ہے جس میں یہ خوبیاں تو نہیں ہیں مگر وہ پڑوسیوں کو تکلیف نہیں دیتی۔ فرمایا وہ جنتی ہے۔ آنحضرت نے لوگوں کو یہاں تک تاکید فرمائی تھی کہ اپنے بچوں کے لئے اگر پھل لاؤ تو یا تو ہمسائے کے گھر بھی بھیجو ورنہ چھلکے باہر نہ پھینکو تاکہ غریب ہمسائے کا دل نہ دکھے[۵]۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ اگر تیرے ہمسائے تجھے اچھا کہتے ہیں

۱؎ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ (النساء - ۶)

۲؎ ما زال جبریل یوصینی بالجار حتی ظننت انہ سیورثہ

۳؎ واللہ لا یؤمن الذی لا یأمن جارہ بوائقہ

۴؎ لیس المؤمن بالذی یشبع وجارہ جائع الی جنبہ

۵؎ یہ اشارہ ہے ایک طویل حدیث کی طرف جسے طبرانی نے نقل کیا ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ صحابہ نے دریافت کیا

تو واقعی تو اچھا ہے اور اگر ہم سائے کی رائے تیرے بارے میں خراب ہے تو ایک برا آدمی ہے[1] مختصر یہ کہ اسلام ان سب لوگوں کو جو ایک دوسرے کے پڑوسی ہوں' آپس میں ہمدرد' مددگار اور شریک رنج و راحت دیکھنا چاہتا ہے۔ ان کے درمیان ایسے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے کہ وہ سب ایک دوسرے پر بھروسہ کریں اور ایک دوسرے کے پہلو میں اپنی جان' مال اور آبرو کو محفوظ سمجھیں۔ رہی وہ معاشرت جس میں ایک دیوار بیچ رہنے والے دو آدمی بھی برسوں ایک دوسرے سے ناآشنا رہیں اور جس میں ایک محلے کے رہنے والے باہم کوئی دلچسپی' کوئی ہمدردی اور کوئی اعتماد نہ رکھتے ہوں' تو ایسی معاشرت ہرگز اسلامی معاشرت نہیں ہو سکتی۔

ان قریبی رابطوں کے بعد تعلقات کا وہ وسیع دائرہ سامنے آتا ہے جو پورے معاشرے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس دائرے میں اسلام ہماری اجتماعی زندگی کو جن بڑے بڑے اصولوں پر قائم کرتا ہے وہ مختصراً یہ ہیں۔

نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تعاون کرو' اور بدی و زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو[2] (قرآن)

یارسول اللہ ہمسائے پر ہمسائے کا کیا حق ہے؟ حضورؐ نے جواب دیا "اگر وہ تجھ سے قرض مانگے تو اسے قرض دے' اگر وہ تجھ سے مدد طلب کرے تو اس کی مدد کر' اگر وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کو جا' اگر وہ محتاج ہو تو اس کی حاجت پوری کر' اگر اسے کوئی بھلائی پہنچے تو اس کو مبارکباد دے' اگر اس پر کوئی مصیبت آئے تو اس سے اظہار ہمدردی کر' اگر وہ مر جائے تو اس کے جنازے میں شریک ہو' اس کے گھر سے اپنے گھر کو اتنا اونچا نہ اٹھا کر اس کی ہوا رک جائے الا یہ کہ وہ خود اس پر راضی ہو' اپنے کھانے کی خوشبو سے یا تو اسے تکلیف نہ دے ورنہ کچھ نہ کچھ اس کے گھر بھی بھیج' اور اگر تو اپنے گھر میں کوئی پھل لائے تو ہمسائے کے ہاں بھی بھیج ورنہ کم از کم چھپا کر لا اور تیرے بچے اسے لے کر باہر نہ جائیں تاکہ ہمسائے کا بچہ اسے نہ ستائے۔"

[1] اذا سمعت جیرانک یقولون قد احسنت فقد احسنت واذا سمعتھم یقولون قد اسأت فقد اسأت۔
[2] وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان (المائدہ)

تمہاری دوستی اور دشمنی خدا کی خاطر ہونی چاہیے۔ جو کچھ دو اس لئے دو کہ خدا اس کا دینا پسند کرتا ہے اور جو کچھ روکو اسلئے روکو کہ خدا کو اس کا دینا پسند نہیں ہے۔[25] (حدیث)

تم وہ بہترین امت ہو جسے دنیا والوں کی بھلائی کے لئے اٹھایا گیا ہے۔ تمہارا کام نیکی کا حکم دینا اور بدی کو روکنا ہے۔[26] (قرآن)

آپس میں بدگمانی نہ کرو۔ ایک دوسرے کے معاملات کا تجسس نہ کرو۔ ایک کے خلاف دوسرے کو نہ اکساؤ۔ آپس کے حسد اور بغض سے بچو۔ ایک دوسرے کی کاٹ میں نہ پڑو۔ اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بن کر رہو۔[27] (حدیث)

کسی ظالم کو ظالم جانتے ہوئے اس کا ساتھ نہ دو۔[28] (حدیث)

غیر حق میں اپنی قوم یا قبیلے کی حمایت کرنا ایسا ہے جیسے تمہارا اونٹ کنویں میں گرنے لگا تو تم بھی اس کی دم پکڑ کر اس کے ساتھ ہی جا گرے۔[29] (حدیث)

دوسروں کے لئے وہی کچھ پسند کرو جو تم خود اپنے لئے پسند کرتے ہو۔[30] (حدیث)

---

[25] من احب لله وابغض لله واعطى لله ومنع لله فقد استكمل الايمان

[26] كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران - ۱۲۰)

[27] اياكم والظن فان الظن اكذب الحديث ولا تحسسوا ولا تجسسوا ولا تناجشوا ولا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وكونوا عباد الله اخوانا۔

[28] من مشى مع ظالم ليقويه وهو يعلم انه ظالم فقد خرج من الاسلام

[29] من نصر قومه على غير الحق فهو كالبعير الذي ردى فهو ينزع بذنبه

[30] واحب للناس ما تحب لنفسك تكن مسلما

۴- اقتصادی نظام

انسان کی معاشی زندگی کو انصاف اور راستی پر قائم رکھنے کے لئے اسلام نے چند اصول اور چند حدود مقرر کر دیے ہیں تاکہ دولت کی پیدائش، استعمال اور گردش کا سارا نظام انہی خطوط کے اندر چلے جو اس کے لئے کھینچ دیئے گئے ہیں۔ دولت کی پیداوار کے طریقے اور اس کی گردش کی صورتیں کیا ہوں، اسلام کو اس سوال سے کوئی بحث نہیں ہے۔ یہ چیزیں تو مختلف زمانوں میں تمدن کے نشوونما کے ساتھ ساتھ بنتی اور بدلتی رہتی ہیں۔ ان کا تعین انسانی حالات وضروریات کے لحاظ سے خودبخود ہو جاتا ہے۔ اسلام جو کچھ چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام زمانوں اور حالات میں انسان کے معاشی معاملات جو شکلیں بھی اختیار کریں ان میں یہ اصول مستقل طور پر قائم رہیں اور ان حدود کی لازماً پابندی کی جائے۔

اسلامی نقطہ نظر سے زمین اور اس کی سب چیزیں خدا نے نوعِ انسانی کے لئے بنائی ہیں، اس لئے ہر انسان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ زمین سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس حق میں تمام انسان برابر کے شریک ہیں۔ کسی کو اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ نہ کسی کو اس معاملے میں دوسروں پر ترجیح ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ کسی شخص یا نسل یا طبقے پر ایسی کوئی پابندی ازروئے شرع جائز نہیں ہو سکتی کہ وہ رزق کے وسائل میں سے بعض کو استعمال کرنے کا حق دار ہی نہ رہے، یا بعض پیشوں کا دروازہ اس کے لئے بند کر دیا جائے۔ اسی طرح ایسے امتیازات بھی شرعاً قائم نہیں ہو سکتے جن کی بنا پر کوئی ذریعۂ معاش یا وسیلۂ رزق کسی مخصوص طبقے یا نسل یا خاندان کا اجارہ بن کر رہ جائے۔ خدا کی بنائی ہوئی زمین پر اس کے پیدا کئے ہوئے وسائل رزق میں سے اپنا حصہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا سب انسانوں کا یکساں حق ہے اور اس کوشش کے مواقع سب کے لئے یکساں کھلے رہنے چاہئیں۔

قدرت کی جن نعمتوں کو تیار کرنے یا کارآمد بنانے میں کسی کی محنت وقابلیت کا کوئی دخل نہ ہو

وہ سب انسانوں کے لئے مباح عام ہیں۔ ہر شخص کو حق ہے کہ اپنی ضرورت بھر ان سے فائدہ اٹھائے۔ دریاؤں اور چشموں کا پانی، جنگل کی لکڑی، خودرو درختوں کے پھل، خودرو گھاس اور چارہ، ہوا اور پانی اور صحرا کے جانور، سطح زمین پر کھلی ہوئی کانیں، اس قسم کی چیزوں پر نہ تو کسی کی اجارہ داری قائم ہو سکتی ہے، اور نہ ایسی پابندیاں لگائی جا سکتی ہیں کہ بندگان خدا کچھ دیئے بغیر ان سے اپنی ضرورتیں پوری نہ کر سکیں۔ ہاں، جو لوگ تجارتی اغراض کے لئے بڑے پیمانے پر ان میں سے کسی چیز کو استعمال کرنا چاہیں ان پر ٹیکس لگایا جا سکتا ہے۔

خدا نے جو چیزیں انسان کے فائدے کے لئے بنائی ہیں انہیں لے کر بیکار ڈال رکھنا صحیح نہیں ہے۔ یا تو ان سے خود فائدہ اٹھاؤ، ورنہ چھوڑ دو تاکہ دوسرے ان سے متمتع ہوں۔ اسی اصول کی بنا پر اسلامی قانون یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین کو تین سال سے زیادہ مدت تک افتادہ حالت میں نہیں رکھ سکتا۔ اگر وہ اس کو زراعت یا عمارت یا کسی دوسرے کام میں استعمال نہ کرے تو تین سال گزر جانے کے بعد وہ متروکہ زمین سمجھی جائیگی، کوئی دوسرا شخص اسے کام میں لے آئے تو اس پر دعوےٰ نہ کیا جا سکے گا، اور اسلامی حکومت کو بھی یہ اختیار ہوگا کہ اس زمین کو کسی کے حوالے کر دے۔[1]

---

[1] امام ابو یوسف رحمۃ اللہ اپنی کتاب الخراج میں طاؤس کے حوالہ سے یہ حدیث نقل فرماتے ہیں:۔

عادی الارض للہ والرسول ثم لکم من بعد فمن احیا منہا میتۃ فہی لہ ولیس لمحتجر حق بعد ثلث سنین

افتادہ زمین (جس کے مالک باقی نہ رہے ہوں) خدا اور رسول کی ہے اور اس کے بعد تمہاری۔ اور جو شخص کسی افتادہ زمین کو آباد کرے وہ اسی کی ہو جائیگی۔ اور بیکار ڈال رکھنے والے کو زمین پر تین سال کے بعد کوئی حق نہ رہے گا۔

پھر امام صاحب حضرت سالم بن عبداللہ اور زہری کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں منبر پر کھڑے ہو کر اعلان فرمایا تھا کہ۔۔

جو شخص براہِ راست قدرت کے خزانے میں سے، کوئی چیز لے اور اپنی محنت و قابلیت سے اس کو کارآمد بنائے وہ اس چیز کا مالک ہے۔ مثلاً کسی افتادہ زمین کو جس پر کسی کے حقوقِ ملکیت ثابت نہ ہوں اگر کوئی شخص اپنے قبضے میں لے لے اور کسی مفید کام میں اسے استعمال کرنا شروع کر دے تو اس کو بیدخل نہیں کیا جا سکتا[ل]۔ اسلامی نظریے کے مطابق دنیا میں تمام مالکانہ حقوق کی ابتدا اسی طرح ہوئی ہے۔ پہلے پہل جب زمین پر انسانی آبادی شروع ہوئی تو سب چیزیں سب انسانوں کے لئے مباحِ عام تھیں، پھر جس جس شخص نے جس مباح چیز کو اپنے قبضے میں لے کر کسی طور پر کارآمد بنا لیا وہ اس کا مالک ہو گیا، یعنی اسے یہ حق حاصل ہو گیا کہ اس کا استعمال اپنے لئے مخصوص رکھے اور دوسرے اسے استعمال کرنا چاہیں تو ان سے اس کا معاوضہ لے۔ یہ چیز انسان کے سارے معاشی معاملات کی فطری بنیاد ہے اور اس بنیاد کو اپنی جگہ قائم رہنا چاہیئے۔

جائز شرعی طریقوں سے جو مالکانہ حقوق کسی کو دنیا میں حاصل ہوں وہ بہرحال احترام کے مستحق ہیں۔ کلام اگر ہو سکتا ہے تو اس امر میں ہو سکتا ہے کہ کوئی ملکیت شرعاً صحیح ہے یا نہیں۔ جو ملکیتیں از روئے شرع ناجائز ہوں انہیں بے شک ختم ہو جانا چاہیئے۔ مگر جو ملکیتیں شرعاً صحیح ہوں کسی حکومت

من احیا ارضا میتة فھی لہ ولیس لمحتجر حق بعد ثلث سنین

جو شخص کسی افتادہ زمین کو آباد کرے وہ اسی کی ہو جائیگی اور بے کار ڈال رکھنے والے کو تین سال گزر جانے کے بعد کوئی حق نہ رہیگا۔

[ل] مذکورۂ بالا احادیث سے استدلال کرتے ہوئے امام ابو یوسف فرماتے ہیں :-

"ہمارے نزدیک (یعنی حنفیہ کے نزدیک) جب افتادہ زمین پر پہلے سے کسی کا حق مالکانہ قائم نہ ہو اور کوئی شخص اسے آباد کرے تو وہ اسی کی ملک ہو جائیگی۔ اسے حق ہے کہ خواہ اس میں خود زراعت کرے یا دوسرے کو زراعت پر دے یا اجرت پر کاشت کرائے اور اس میں پانی کی نالیاں نکالے یا اور کوئی ایسا کام اس میں کرے جو اس زمین کی بہتری کے لئے ہو" (کتاب الخراج صفحہ ۳۷)

اور کسی قانون ساز مجلس کو یہ حق نہیں ہے کہ انہیں سلب کرے یا ان کے مالکوں کے شرعی حقوق میں کسی قسم کی کمی بیشی کرے۔ اجتماعی بہتری کا نام لے کر کوئی ایسا نظام قائم نہیں کیا جا سکتا جو شریعت کے دیئے ہوئے حقوق کو پامال کرنے والا ہو۔ جماعت کے مفاد کے لئے افراد کی ملکیتوں پر جو پابندیاں شریعت نے خود لگادی ہیں ان میں کمی کرنا جتنا بڑا ظلم ہے اتنا ہی بڑا ظلم ان پر اضافہ کرنا بھی ہے۔ یہ بات اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ افراد کے شرعی حقوق کی حفاظت کرے اور ان سے جماعت کے وہ حقوق وصول کرے جو شریعت نے ان پر عائد کئے ہیں۔

خدا نے اپنی نعمتوں کی تقسیم میں مساوات ملحوظ نہیں رکھی ہے بلکہ اپنی حکمت کی بنا پر بعض انسانوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ حسن، خوش آوازی، تندرستی، جسمانی طاقتیں، دماغی قابلیتیں، پیدائشی ماحول، اور اسی طرح کی دوسری چیزیں سب انسانوں کو یکساں نہیں ملیں۔ ایسا ہی معاملہ رزق کا بھی ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی فطرت خود اس بات کی متقاضی ہے کہ انسانوں کے درمیان رزق میں تفاوت ہو۔ لہٰذا وہ تمام تدبیریں اسلامی نقطۂ نظر سے مقصد اور اصول میں غلط ہیں جو انسانوں کے درمیان ایک مصنوعی معاشی مساوات قائم کرنے کے لئے اختیار کی جائیں۔ اسلام جس مساوات کا قائل ہے وہ رزق میں مساوات نہیں بلکہ حصولِ رزق کی جدوجہد کے مواقع میں مساوات ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سوسائٹی میں ایسی قانونی اور رواجی رکاوٹیں باقی نہ رہیں جن کی بنا پر کوئی شخص اپنی قوت و استعداد کے مطابق معاشی جدوجہد نہ کر سکتا ہو، اور ایسے امتیازات بھی قائم نہ رہیں جو بعض طبقوں، نسلوں اور خاندانوں کی پیدائشی خوش نصیبی کو مستقل قانونی حقوق میں تبدیل کر دیتے ہوں۔ یہ دونوں طریقے فطری نامساوات کی جگہ زبردستی ایک مصنوعی نامساوات قائم کرتے ہیں، اس لئے اسلام انہیں مٹا کر سوسائٹی کے معاشی نظام کو ایسی فطری حالت پر لے آنا چاہتا ہے جس میں ہر شخص کے لئے کوشش کے مواقع کھلے ہوں۔ مگر جو لوگ چاہتے ہیں کہ کوشش کے ذرائع اور نتائج میں بھی سب لوگوں کو زبردستی برابر کر دیا جائے، اسلام ان سے متفق نہیں ہے، کیونکہ وہ فطری نامساوات کو مصنوعی مساوات میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ فطرت سے قریب تر نظام صرف وہی ہو سکتا ہے جس میں ہر شخص معیشت کے میدان میں اپنی

دوڑ کی ابتدا اسی مقام اور اسی حالت سے کرے جس پر خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ جو موٹر لئے ہوئے آیا ہے وہ موٹر ہی پر چلے، جو صرف دو پاؤں لایا ہے وہ پیدل ہی چلے، اور جو لنگڑا پیدا ہوا ہے وہ لنگڑا کر ہی چلنا شروع کرے۔ سوسائٹی کا قانون نہ تو ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ موٹر والے کا مستقل اجارہ موٹر پر قائم کر دے اور لنگڑے کے لئے موٹر کا حصول ناممکن بنا دے، اور نہ ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ سب کی دوڑ زبردستی ایک ہی مقام اور ایک ہی حالت سے شروع ہو اور آگے تک انہیں لازماً ایک دوسرے کے ساتھ باندھ رکھا جائے۔ برعکس اس کے قوانین ایسے ہونے چاہئیں جن میں اس امر کا کھلا امکان موجود ہے کہ جس نے اپنی دوڑ لنگڑا کر شروع کی تھی وہ اپنی محنت و قابلیت سے موٹر پا سکتا ہو تو ضرور پائے اور جو ابتدا میں موٹر پر چلا تھا وہ بعد میں اپنی نااہلی سے لنگڑا ہو کر رہ جائے تو رہ جائے۔

اسلام صرف اتنا ہی نہیں چاہتا کہ اجتماعی زندگی میں معاشی دوڑ کھلی اور بے لاگ ہو بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس میدان میں دوڑنے والے ایک دوسرے کے لئے بے رحم اور بے درد نہ ہوں، ہمدرد اور مددگار ہوں۔ وہ ایک طرف اپنی اخلاقی تعلیم سے لوگوں میں یہ ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ اپنے درماندہ اور پسماندہ بھائیوں کو سہارا دیں۔ دوسری طرف وہ تقاضا کرتا ہے کہ سوسائٹی میں ایک مستقل ادارہ ایسا موجود رہے جو معذوروں اور محروم اور بے وسیلہ لوگوں کی مدد کا ضامن ہو۔ جو لوگ معاشی دوڑ میں حصہ لینے کے قابل نہ ہوں وہ اس ادارے سے اپنا حصہ پائیں، جو لوگ اتفاقات زمانہ سے اس دوڑ میں گر پڑے ہوں انہیں یہ ادارہ اٹھا کر پھر چلنے کے قابل بنائے، اور جن لوگوں کو جدوجہد کے میدان میں اترنے کے لئے سہارے کی ضرورت ہو انہیں اس ادارے سے سہارا ملے۔ اس مقصد کے لئے اسلام نے از روئے قانون یہ طے کیا ہے کہ ملک کی تمام جمع شدہ دولت پر ڈھائی فی صدی سالانہ اور اسی طرح پورے تجارتی سرمایہ پر بھی ڈھائی فی صدی سالانہ زکوٰۃ وصول کی جائے، تمام عشری زمینوں کی زرعی پیداوار کا دس فیصدی یا پانچ فی صدی حصہ لیا جائے، بعض معدنیات کی پیداوار کا بیس فی صدی حصہ لیا جائے، مویشیوں کی ایک خاص تعداد پر بھی ایک خاص تناسب سے سالانہ زکوٰۃ لگائی جائے، اور یہ تمام سرمایہ غریبوں، یتیموں اور محتاجوں کی مدد کے لئے استعمال کیا جائے۔ یہ ایک ایسا اجتماعی انشورنس ہے جس کی موجودگی میں اسلامی سوسائٹی

کے اندر کوئی شخص زندگی کی ناگزیر ضروریات سے کبھی محروم نہیں رہ سکتا۔ کوئی محنت کش آدمی کبھی اتنا مجبور نہیں ہو سکتا کہ فاقے کے ڈر سے خدمت کی وہی شرائط منظور کر لے جو کارخانہ دار یا زمیندار پیش کر رہا ہو۔ کسی شخص کی طاقت اس کم سے کم معیار سے کبھی نیچے نہیں گر سکتی جو معاشی جدوجہد میں حصہ لینے کے لئے ضروری ہے۔

فرد اور جماعت کے درمیان اسلام ایسا توازن قائم کرنا چاہتا ہے جس میں فرد کی شخصیت اور اس کی آزادی بھی برقرار رہے اور اجتماعی مفاد کے لئے اس کی آزادی نقصان دہ بھی نہ ہو بلکہ لازمی طور پر مفید ہو۔ اسلام کسی ایسی سیاسی یا معاشی تنظیم کو پسند نہیں کرتا جو فرد کو جماعت میں گم کر دے اور اس کے لئے وہ آزادی باقی نہ چھوڑے جو اس کی شخصیت کے صحیح نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ کسی ملک کے تمام ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنا دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ملک کے تمام افراد جماعتی شکنجہ میں جکڑ جائیں۔ اس حالت میں ان کی انفرادیت کا بقاء و ارتقاء سخت مشکل بلکہ غیر ممکن ہے۔ انفرادیت کے لئے جس طرح سیاسی اور معاشرتی آزادی ضروری ہے اسی طرح معاشی آزادی بھی بہت بڑی حد تک ضروری ہے۔ اگر ہم آدمیت کا بالکل استیصال نہیں کر دینا چاہتے تو ہماری اجتماعی زندگی میں اتنی گنجائش ضرور رہنی چاہیے کہ ایک بندۂ خدا اپنی روزی آزادانہ پیدا کر کے اپنے ضمیر کا استقلال برقرار رکھ سکے اور اپنی ذہنی و اخلاقی قوتوں کو اپنے رجحانات کے مطابق نشوونما دے سکے۔ راتب بندی کا رزق جس کی کنجیاں دوسروں کے ہاتھ میں ہوں، اگر فراواں بھی ہو تو خوشگوار نہیں کیونکہ اس سے پرورش میں جو کوتاہی آتی ہے محض جسم کی فربہی اس کی تلافی کبھی نہیں کر سکتی۔

جس طرح اسلام ایسے نظام کو ناپسند کرتا ہے اسی طرح وہ اس اجتماعی نظام کو بھی پسند نہیں کرتا جو افراد کو معاشرت اور معیشت میں بے لگام آزادی دیتا ہے اور انہیں کھلی چھٹی دے دیتا ہے کہ اپنی خواہشات یا اپنے مفاد کی خاطر جماعت کو جس طرح چاہیں نقصان پہنچائیں۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اسلام نے جو متوسط راہ اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے فرد کو جماعت کی خاطر چند حدود اور ذمہ داریوں کا پابند بنایا جائے، پھر اسے اپنے معاملات میں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ ان حدود اور ذمہ داریوں کی ساری

تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے، میں ان کا صرف ایک مختصر سا نقشہ آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

پہلے کسب معاش کو لیجیے۔ دولت کمانے کے ذرائع میں اسلام نے جتنی باریک بینی کے ساتھ جائز اور ناجائز کی تفریق کی ہے اتنی باریک کسی قانون نے نہیں کی۔ وہ چن چن کر ان تمام ذرائع کو حرام قرار دیتا ہے جن سے ایک شخص دوسرے اشخاص کو یا بحیثیت مجموعی پوری سوسائٹی کو اخلاقی یا مادی نقصان پہنچا کر اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ شراب اور نشہ آور چیزوں کا بنانا اور بیچنا، فحش کاری اور رقص و سرود کا پیشہ، جوا، سٹہ، لاٹری، سود، قیاس اور دھوکے اور جگا بیے کے سودے، ایسے تجارتی طریقے جن میں ایک ذہنی طرف کا نفع یقینی اور دوسرے کا مشتبہ ہو، ضرورت کی چیزوں کو روک کر ان کی قیمتیں چڑھانا، اور اسی طرح کے بہت سے وہ کاروبار جو اجتماعی طور پر ضرر رساں ہیں، اسلامی قانون میں قطعی طور پر حرام کر دیے گئے ہیں۔ اس معاملے میں اگر آپ اسلام کے معاشی قانون کا جائزہ لیں گے تو حرام طریقوں کی ایک طویل فہرست آپ کے سامنے آئے گی اور ان میں بہت سے وہ طریقے آپ کو ملیں گے جنہیں استعمال کر کے ہی موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں لوگ کروڑپتی بنتے ہیں۔ اسلام ان سب طریقوں کو ازروئے قانون بند کرتا ہے اور آدمی کو صرف ان طریقوں سے دولت کمانے کی آزادی دیتا ہے جن سے وہ دوسروں کی کوئی حقیقی اور مفید خدمت انجام دے کر انصاف کے ساتھ اس کا معاوضہ حاصل کرے۔

حلال ذرائع سے کمائی ہوئی دولت پر اسلام آدمی کے حقوق ملکیت تسلیم کرتا ہے مگر یہ حقوق بھی غیر محدود نہیں ہیں۔ وہ آدمی کو پابند کرتا ہے کہ اپنی حلال کمائی کو خرچ بھی جائز راستوں ہی میں کرے۔ خرچ پر اس نے ایسی قیود لگا دی ہیں جن سے آدمی ایک ستھری اور پاکیزہ زندگی تو بسر کر سکتا ہے مگر عیاشیوں میں دولت اڑا نہیں سکتا، نہ شان و شوکت کے اظہار میں اس قدر حد سے گزر سکتا ہے کہ دوسروں پر اس کی خدائی کا سکہ جمنے لگے۔ بیجا خرچ کی بعض صورتوں کو تو اسلامی قانون میں صراحتہً ممنوع ٹھیرا دیا گیا ہے، اور بعض دوسری صورتوں کی اگرچہ صراحت نہیں ہے لیکن اسلامی حکومت کو یہ اختیارات حاصل

ہیں کہ اپنی دولت میں ناروا تصرفات کرنے سے لوگوں کو حکماً روک دے۔

جائز اور معقول اخراجات سے جو دولت آدمی کے پاس بچے اُسے وہ جمع بھی کر سکتا ہے اور
دولت پیدا کرنے میں بھی لگا سکتا ہے۔ مگر ان دونوں حقوق پر پابندیاں ہیں۔ جمع کرنے کی صورت م
اسے نصاب سے زائد دولت پر ڈھائی فیصدی سالانہ زکوٰۃ دینی ہوگی۔ کاروبار میں لگانا چاہے
صرف جائز کاروبار ہی میں لگا سکتا ہے۔ جائز کاروبار خواہ آدمی خود کرے یا کسی دوسرے کو اپنا سر
دے، یا زمین یا آلات و اسباب کی صورت میں دے کر نفع و نقصان کا شریک ہو جائے، یہ دو
صورتیں جائز ہیں۔ ان حدود کے اندر کام کر کے اگر کوئی شخص کروڑپتی بھی بن جائے تو اسلام کی نگاہ
یہ کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے بلکہ خدا کا انعام ہے۔ لیکن جماعتی مفاد کے لئے وہ اس پر دو شرط
عائد کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اپنے تجارتی مال پر زکوٰۃ اور زرعی پیداوار پر عُشر ادا کرے۔ دوسر
یہ کہ وہ اپنی تجارت یا صنعت یا زراعت میں جن لوگوں کے ساتھ شرکت یا اجرت کا معاملہ کر
ان سے انصاف کرے۔ یہ انصاف اگر وہ خود نہ کرے گا تو اسلامی حکومت اسے انصاف پر مجبور کر

پھر جو دولت ان جائز حدود کے اندر فراہم ہو اس کو بھی اسلام زیادہ دیر تک سمٹا نہیں رہ
دیتا بلکہ اپنے قانون وراثت کے ذریعے سے ہر نسل کے بعد دوسری پشت میں اسے پھیلا دیتا ہے۔
معاملے میں اسلامی قانون کا رجحان دنیا کے تمام دوسرے قوانین کے رجحانات سے مختلف ہے۔ دو
قوانین کوشش کرتے ہیں کہ جو دولت ایک دفعہ سمٹ چکی ہے وہ پشت در پشت سمٹی ہی رہے۔
اس کے اسلام ایسا قانون بناتا ہے کہ جو دولت ایک شخص نے اپنی زندگی میں فراہم کی ہو وہ اس کے م
ہی اس کے قریبی عزیزوں میں بانٹ دی جائے۔ قریبی عزیز نہ ہوں تو دور کے رشتہ دار حصہ رسد
اس کے وارث ہوں، اور اگر کوئی دور پرے کا رشتہ دار بھی نہ ہو تو پھر پوری مسلم سوسائٹی اس
کی حقدار ہے۔ یہ قانون کسی بڑی سرمایہ داری و زمینداری کو مستقل اور دائم نہیں رہنے دیتا۔ پچھلی سا
پابندیوں کے باوجود اگر دولت کے سمٹاؤ سے کوئی خرابی پیدا ہو بھی جائے تو یہ آخری ضرب اس کا ا
کر دیتی ہے۔۔

۵۔ روحانی نظام

اسلام کا روحانی نظام کیا ہے، اور زندگی کے پورے نظام سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اس سوال کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس فرق کو اچھی طرح سمجھ لیں جو روحانیت کے اسلامی تصور اور دوسرے مذہبی اور فلسفیانہ نظاموں کے تصورات میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرق ذہن نشین نہ ہونے کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کے روحانی نظام پر گفتگو کرتے ہوئے آدمی کے دماغ میں بالعموم بہت سے وہ تصورات گھومنے لگتے ہیں جو عموماً "روحانیت" کے لفظ سے وابستہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ پھر اس اُلجھن میں پڑ کر آدمی کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آخر یہ کس قسم کا روحانی نظام ہے جو روح کو جانے پہچانے دائرے سے گزر کر مادہ وجسم کے دائرے میں دخل دیتا ہے اور صرف دخل ہی نہیں دیتا بلکہ اس پر حکمرانی کرنا چاہتا ہے۔

فلسفہ و مذہب کی دنیا میں عام طور پر جو تخیل کارفرما رہا ہے وہ یہ ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دونوں کا عالم جدا ہے۔ دونوں کے تقاضے الگ بلکہ باہم مخالف ہیں۔ ان دونوں کی ترقی ایک ساتھ ممکن نہیں ہے۔ روح کے لئے جسم اور مادے کی دنیا ایک قید خانہ ہے۔ مادی زندگی کے تعلقات اور دلچسپیاں وہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ہیں جن میں روح جکڑی جاتی ہے۔ دنیا کا کاروبار اور معاملات وہ دلدل ہیں جس میں پھنس کر روح کی پرواز ختم ہو جاتی ہے۔ اس تخیل کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ روحانیت اور دنیاداری کے راستے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو گئے۔ جن لوگوں نے دنیاداری اختیار کی وہ اول ہی قدم پر مایوس ہو گئے کہ یہاں روحانیت ان کے ساتھ نہ چل سکے گی۔ اس چیز نے ان کو مادہ پرستی میں غرق کر دیا۔ معاشرت، تمدن، سیاست، معاشیت، غرض مادی زندگی کے سارے شعبے روحانیت کے نور سے خالی ہو گئے اور بالآخر زمین ظلم سے بھر گئی۔ دوسری طرف جو لوگ روحانیت کے طلبگار ہوئے انہوں نے اپنی روح کی ترقی کے لئے ایسے راستے تلاش کئے جو دنیا کے باہر ہی باہر نکل جاتے ہیں کیونکہ ان کے نقطۂ نظر سے روحانی ترقی کا کوئی ایسا راستہ تو

ممکن ہی نہ تھا جو دنیا کے اندر سے ہو کر گزرتا ہو۔ ان کے نزدیک روح کو پروان چڑھانے کے لیے جسم کو مضمحل کرنا ضروری تھا اس لئے انہوں نے ایسی ریاضتیں ایجاد کیں جو نفس کو مارنے والی اور جسم کو بے حس یا بے کار کر دینے والی ہوں۔ روحانی تربیت کے لیے جنگلوں، پہاڑوں اور عزلت کے گوشوں کو انہوں نے موزوں ترین مقامات سمجھا تاکہ تمدن کا ہنگامہ گیان دھیان کے مشغلوں میں خلل نہ ڈالنے پائے۔ روح کے نشوونما کی کوئی صورت انہیں اس کے سوا ممکن نظر نہ آئی کہ دنیا اور اس کے دھندوں سے دستکش ہو جائیں اور ان سارے رشتوں کو کاٹ پھینکیں جو اسے مادیات کے عالم سے وابستہ رکھتے ہیں۔

پھر جسم و روح کے اس تضاد نے انسان کے لئے کمال کے بھی دو مختلف مفہوم اور نصب العین پیدا کر دیئے۔ ایک طرف دنیوی زندگی کا کمال جس کا مفہوم یہ قرار پایا کہ انسان صرف مادی نعمتوں سے مالا مال ہو، اور اس کی انتہا یہ ٹھہری کہ آدمی ایک اچھا پرندہ، ایک بہترین مگرمچھ، ایک عمدہ گھوڑا اور ایک کامیاب بھیڑیا بن جائے۔ دوسری طرف روحانی زندگی کا کمال جس کا مفہوم یہ قرار پایا کہ انسان کچھ فوق الفطری طاقتوں کا مالک ہو جائے اور اس کی انتہا یہ ٹھہری کہ آدمی ایک اچھا ریڈیو سیٹ، ایک طاقت ور دوربین اور ایک نازک خوردبین بن جائے، یا اس کی نگاہ اور اس کے ہاتھ ایک پورے دواخانے کا کام دینے لگیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملہ میں دنیا کے تمام مذہبی اور فلسفیانہ نظاموں سے مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی روح کو خدا نے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے۔ کچھ اختیارات، کچھ فرائض اور کچھ ذمہ داریاں اس کے سپرد کی ہیں۔ اور انہیں ادا کرنے کے لئے ایک بہترین اور موزوں ترین ساخت کا جسم اسے عطا کیا ہے۔ یہ جسم اس کو عطا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اختیارات کے استعمال اور اپنی متعلقہ خدمات کی انجام دہی میں اس سے کام لے۔ لہٰذا یہ جسم اس روح کا قید خانہ نہیں بلکہ اس کا کارخانہ ہے۔ اور اس روح کے لئے کوئی ترقی اگر ممکن ہے تو اسی طرح ممکن ہے کہ وہ اس کارخانے کے آلات اور طاقتوں کو استعمال کر کے اپنی قابلیتوں کا اظہار کرے۔ پھر یہ دنیا کوئی دار العذاب نہیں ہے جس میں انسانی روح کسی طرح آکر پھنس گئی ہو، بلکہ یہ تو وہ کارگاہ ہے جس میں کام کرنے کے لئے خدا نے اسے بھیجا ہے۔ یہاں کی بے شمار چیزیں اس کے تصرف میں دی گئی ہیں۔ یہاں دوسرے بہت سے انسان اسی خلافت کے فرائض

انجام دینے کے لئے اس کے ساتھ پیدا کئے گئے ہیں۔ یہاں فطرت کے تقاضوں سے تمدن، معیشت، معاشرت، سیاست اور دوسرے شعبہائے زندگی اس کے لئے وجود میں آئے ہیں۔ یہاں اگر کوئی روحانی ترقی ممکن ہے تو اس کی صورت یہ نہیں ہے کہ آدمی اس کارگاہ سے منہ موڑ کر کسی گوشے میں جا بیٹھے، بلکہ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ اس کے اندر کام کر کے اپنی قابلیت کا ثبوت دے۔ یہ اس کے لئے ایک امتحان گاہ ہے۔ زندگی کا ہر پہلو اور ہر شعبہ گویا امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ گھر، محلہ، بازار، منڈی، دفتر، کارخانہ، مدرسہ، کچہری، تھانہ، چھاؤنی، پارلیمنٹ، صلح کانفرنس اور میدانِ جنگ، سب مختلف مضمونوں کے پرچے ہیں جو اسے کرنے کے لئے دیئے گئے ہیں۔ وہ اگر ان میں سے کوئی پرچہ بھی نہ کرے یا اکثر پرچوں کو سادہ ہی چھوڑ دے تو نتیجہ میں آخر صفر کے سوا اور کیا پا سکتا ہے۔ کامیابی اور ترقی کا امکان اگر ہو سکتا ہے تو اسی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا سارا وقت اور اپنی ساری توجہ امتحان دینے میں صرف کرے اور جتنے پرچے بھی اسے دئے جائیں ان سب پر کچھ نہ کچھ کر کے دکھائے۔

اس طرح اسلام زندگی کے راہبانہ تخیل کو رد کر دیتا ہے اور انسان کے لئے روحانی ترقی کا راستہ دنیا کے باہر سے نہیں بلکہ اس کے اندر سے نکالتا ہے۔ روح کے نشوونما اور بالیدگی اور فلاح و کامرانی کی اصل جگہ اس کے نزدیک کارگاہ حیات کے عین منجدھار میں واقع ہے نہ کہ اس کے کنارے پر۔

اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ ہمارے سامنے روح کی ترقی اور تنزل کا معیار کیا پیش کرتا ہے۔ اس سوال کا جواب اسی خلافت کے تصور میں موجود ہے جس کا ابھی میں ذکر کر چکا ہوں۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انسان اپنے پورے کارنامۂ حیات کے لئے خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ اس کا فرض یہ ہے کہ زمین میں جو اختیارات اور ذرائع اُسے دیئے گئے ہیں انہیں خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرے۔ جو قابلیتیں اور طاقتیں اسے بخشی گئی ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ خدا کی رضا حاصل کرنے میں صرف کرے۔ جن مختلف قسم کے تعلقات میں دوسرے انسانوں کے ساتھ اسے وابستہ کیا گیا ہے ان میں ایسا رویہ اختیار کرے جو خدا کو پسند ہے۔ اور بالعمل اپنی تمام کوششیں اور محنتیں اس راہ میں صرف کر دے کہ زمین اور اس کی زندگی کا انتظام اتنا بہتر ہو جتنا اس کا خدا اسے بہتر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس خدمت کو انسان جس قدر زیادہ احساسِ ذمہ داری، فرض شناسی

اطاعت و فرمانبرداری اور مالک کی رضا جوئی کے ساتھ انجام دیگا اسی قدر زیادہ وہ خدا سے قریب ہوگا اور خدا کا قرب ہی اسلام کی نگاہ میں روحانی ترقی ہے۔ اس کے برعکس وہ جتنا سُست، کام چور اور نافرض شناس ہوگا، یا جس قدر سرکش، باغی اور نافرمان ہوگا اتنا ہی وہ خدا سے دور رہیگا، اور خدا سے دوری ہی کا نام اسلام کی زبان میں روحانی تنزل ہے۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے دین دار اور دنیادار دونوں کا دائرۂ عمل ایک ہی ہے۔ ایک ہی کارگاہ ہے جس میں دونوں کام کرینگے بلکہ دین دار آدمی دنیادار سے بھی زیادہ انہماک کے ساتھ مشغول ہوگا۔ گھر کی چار دیواری سے لیکر بین الاقوامی تعلقات کے چوراہے تک جتنے بھی زندگی کے معاملات ہیں ان سب کی ذمہ داریاں دین دار بھی دنیادار کے برابر بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر ہی اپنے ہاتھ میں لیگا۔ البتہ جو چیز ان دونوں کے راستے ایک دوسرے سے الگ کردیگی وہ خدا کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت ہے۔ دین دار جو کچھ کریگا اس احساس کے ساتھ کریگا کہ وہ خدا کے سامنے ذمہ دار ہے، اس غرض سے کریگا کہ اسے خدا کی خوشنودی حاصل ہو، اور اس قانون کے مطابق کریگا جو خدا نے اس کے لیے مقرر کردیا ہے۔ اس کے برعکس دنیادار جو کچھ کریگا غیر ذمہ دارانہ کریگا، خدا سے بے نیاز ہوکر کریگا، اور اپنے من مانے طریقوں سے کریگا۔ یہی فرق دین دار کی پوری مادی زندگی کو سراسر روحانی زندگی بنا دیتا ہے، اور دنیادار کی ساری زندگی کو روحانیت کے نور سے محروم کردیتا ہے۔

اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤنگا کہ اسلام دنیوی زندگی کے اس منجدھار میں انسان کے روحانی ارتقاء کا راستہ کس طرح بناتا ہے۔

اس راستہ کا پہلا قدم ایمان ہے، یعنی آدمی کے دل و دماغ میں اس خیال کا بس جانا کہ خدا ہی اس کا مالک، حاکم اور معبود ہے، خدا ہی کی رضا اس کی تمام کوششوں کا مقصود ہے، اور خدا ہی کا حکم اس کی زندگی کا قانون ہے۔ یہ خیال جس قدر زیادہ پختہ اور راسخ ہوگا اتنی ہی زیادہ مکمل اسلامی ذہنیت بنے گی اور اسی قدر زیادہ ثابت قدمی کے ساتھ انسان روحانی ترقی کی راہ پر چل سکیگا۔

اس راہ کی دوسری منزل اطاعت ہے، یعنی آدمی کا بالفعل اپنی خود مختاری سے دست بردار

ہو جانا اور عملاً اُس خدا کی بندگی اختیار کر لینا جسے وہ عقیدۃً اپنا خدا تسلیم کر چکا ہے۔ اِسی اطاعت کا نام قرآن کی اصطلاح میں "اسلام" ہے۔

تیسری منزل تقویٰ کی ہے جسے ہم عام فہم زبان میں فرض شناسی اور احساس ذمہ داری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے ہر پہلو میں یہ سمجھتے ہوئے کام کرے کہ اسے اپنے افکار، اقوال اور افعال کا خدا کو حساب دینا ہے، ہر اس کام سے رک جائے جس سے خدا نے منع کیا ہے، ہر اس خدمت پر کمربستہ ہو جائے جس کا خدا نے حکم دیا ہے، اور پوری ہوشمندی کے ساتھ حلال و حرام، صحیح و غلط، اور خیر و شر کے درمیان تمیز کرتا ہوا چلے۔

آخری اور سب سے اونچی منزل احسان کی ہے۔ احسان کے معنی یہ ہیں کہ بندے کی مرضی خدا کی مرضی کے ساتھ متحد ہو جائے۔ جو کچھ خدا کو پسند ہے، بندے کی اپنی پسند بھی وہی ہو، اور جو کچھ خدا کو ناپسند ہے، بندے کا اپنا دل بھی اسے ناپسند کرے۔ خدا جن برائیوں کو اپنی زمین میں نہیں دیکھنا چاہتا، بندہ صرف خود ہی ان سے نہ بچے بلکہ انہیں دنیا سے مٹا دینے کے لئے اپنی تمام قوتیں اور اپنے تمام ذرائع صرف کر دے۔ اور خدا جن بھلائیوں سے اپنی زمین کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے، بندہ صرف اپنی زندگی ہی کو ان سے مزین کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اپنی جان لڑا کر دنیا بھر میں انہیں پھیلانے اور قائم کرنے کی کوشش کرے۔ اس مقام پر پہنچ کر بندے کو اپنے خدا کا انتہائی قرب نصیب ہوتا ہے، اور اسی لئے یہ انسان کے روحانی ارتقا کی بلند ترین منزل ہے۔

روحانی ترقی کا یہ راستہ صرف افراد ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ جماعتوں اور قوموں کے لئے بھی ہے۔ ایک فرد کی طرح ایک قوم بھی ایمان، اطاعت اور تقویٰ کی منزلوں سے گزر کر احسان کی انتہائی منزل تک پہنچ سکتی ہے، اور ایک ریاست بھی اپنے پورے نظام کے ساتھ مومن، مسلم، متقی اور محسن بن سکتی ہے۔ بلکہ درحقیقت اسلام کا منشا مکمل طور پر تو پورا ہی اُس وقت ہوتا ہے جبکہ ایک پوری قوم کی قوم اس راہ پر گامزن ہو، اور دنیا میں ایک متقی و محسن ریاست قائم ہو جائے۔

اب روحانی تربیت کے اُس نظام پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجیے جو افراد اور سوسائٹی کو اس طرز پر تیار کرنے

کے لئے اسلام نے تجویز کیا ہے۔ اس نظام کے چار ارکان ہیں:-

پہلا رکن نماز ہے۔ یہ روزانہ پانچ وقت آدمی کے ذہن میں خدا کی یاد تازہ کرتی رہتی ہے، اُس کا خوف دلاتی ہے، اُس کی محبت پیدا کرتی ہے، اُس کے احکام بار بار سامنے لاتی ہے، اور اس کی اطاعت کی مشق کراتی ہے۔ یہ نماز محض انفرادی نہیں ہے بلکہ اسے جماعت کے ساتھ فرض کیا گیا ہے تاکہ پوری سوسائٹی مجموعی طور پر روحانی ترقی کی اس راہ پر سفر کرنے کے لئے تیار ہو۔

دوسرا رکن روزہ ہے جو ہر سال پورے ایک مہینہ تک مسلمان افراد کو فرداً فرداً اور مسلم سوسائٹی کو بحیثیت مجموعی تقویٰ کی تربیت دیتا رہتا ہے۔

تیسرا رکن زکوٰۃ ہے جو مسلمان افراد میں مالی ایثار، آپس کی ہمدردی اور تعاون کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ آج کل کے لوگ غلطی سے زکوٰۃ کو "ٹیکس" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ زکوٰۃ کی روح ٹیکس کی اسپرٹ سے بالکل مختلف ہے۔ زکوٰۃ کے اصل معنی نشوونما اور پاکیزگی کے ہیں۔ اس لفظ سے اسلام یہ حقیقت آدمی کے ذہن نشین کرتا ہے کہ خدا کی محبت میں اپنے بھائیوں کی جو مالی مدد تم کرو گے اس سے تمہاری روح کو بالیدگی اور تمہارے اخلاق کو پاکیزگی نصیب ہوگی۔

چوتھا رکن حج ہے۔ یہ خدا پرستی کے محور پر اہل ایمان کی ایک عالمگیر برادری بناتا ہے اور ایک ایسی بین الاقوامی تحریک چلاتا ہے جو دنیا میں صدیوں سے دعوتِ حق پر لبیک کہہ رہی ہے اور انشاء اللہ ابد تک کہتی رہیگی۔

اسلام کا نظامِ حیات

یہ پانچ نشری تقریریں جن پر "ترجمان" کا تازہ پرچہ مشتمل ہے، عنوان بالا کے ساتھ علیحدہ کتابی شکل میں بھی چھپ گئی ہیں۔ ضخامت پمفلٹ سائز میں ۴۴ صفحات کتاب کے گرد دیدہ زیب ٹائٹل۔ قیمت ۱۰ فی نسخہ

مکتبہ جماعت اسلامی، اچھرہ، لاہور

سرورِ عالم کا اصلی کارنامہ

[یہ تقریر ۱۲ ربیع الاول ۱۳۶۹ھ کو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کی گئی تھی۔ فائدۂ عام کے لئے اس میں احادیث کے اصل الفاظ ہم نے ساتھ ساتھ نقل کر دیئے ہیں۔ یہ عربی عبارات نشر نہیں کی گئی تھیں]

دنیا جانتی ہے کہ نبی عربی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے اس برگزیدہ گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو قدیم ترین زمانہ سے نوعِ انسانی کو خدا پرستی اور حسنِ اخلاق کی تعلیم دینے کے لئے اٹھتا رہا ہے۔ ایک خدا کی بندگی اور پاکیزہ اخلاقی زندگی کا درس جو ہمیشہ سے دنیا کے پیغمبر دیتے اور رہنمائی دیتے رہے ہیں وہی آنحضرت نے بھی دیا ہے۔ انہوں نے نہ کسی نئے خدا کا تصور پیش نہیں کیا ہے اور نہ کسی نرالے اخلاق ہی کا سبق دیا ہے جو ان سے پہلے کے رہبرانِ انسانیت کی تعلیم سے مختلف ہو۔ پھر سوال یہ ہے کہ ان کا وہ اصلی کارنامہ کیا ہے جس کی بنا پر ہم انہیں تاریخ انسانی کا سب سے بڑا آدمی قرار دیتے ہیں؟

اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ بیشک آنحضرت سے پہلے انسان خدا کی ہستی اور اس کی وحدانیت سے آشنا تھا، مگر اس بات سے پوری طرح واقف نہ تھا کہ اس فلسفیانہ حقیقت کا انسانی اخلاقیات سے کیا تعلق ہے۔ بلاشبہ انسان کو اخلاق کے عمدہ اصولوں سے آگاہی حاصل تھی، مگر اسے واضح طور پر یہ معلوم نہیں تھا کہ زندگی کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں میں ان اخلاقی اصولوں کی عملی ترجمانی کس طرح ہونی چاہیئے۔ خدا پر ایمان، اصولِ اخلاق، اور عملی زندگی، یہ تین الگ الگ چیزیں تھیں جن کے درمیان کوئی منطقی ربط، کوئی گہرا لازم اور کوئی نتیجہ خیز رشتہ موجود نہ تھا۔ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے ان تینوں کو ملا کر ایک نظام بنا دیا اور ان کے امتزاج سے ایک مکمل تہذیب و تمدن کا نقشہ محض خیال کی دنیا ہی میں نہیں بلکہ عمل کی دنیا میں بھی قائم کر کے دکھا دیا۔

انہوں نے بتایا کہ خدا پر ایمان محض ایک فلسفیانہ حقیقت کے مان لینے کا نام نہیں ہے بلکہ اس ایمان کا مزاج اپنی عین فطرت ہی کے لحاظ سے ایک خاص قسم کے اخلاق کا تقاضا کرتا ہے اور اس اخلاق کا ظہورِ انسان

کی عملی زندگی کے پورے رویہ میں ہونا چاہیئے۔ ایمان ایک تخم ہے جو نفس انسانی میں جڑ پکڑتے ہی اپنی فطرت کے مطابق عملی زندگی کے ایک پورے درخت کی تخلیق شروع کر دیتا ہے اور اس درخت کے تنے سے لے کر اس کی شاخ شاخ اور پتی پتی تک میں اخلاق کا وہ جیون رس جاری و ساری ہو جاتا ہے جس کی سوتیں تخم کے ریشوں سے ابلتی ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ زمین میں بوئی تو جائے آم کی گٹھلی اور اس سے نکل آئے ببولوں کا درخت، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ دل میں بویا تو گیا ہو خدا پرستی کا بیج اور اس سے رونما ہو جائے ایک مادہ پرستانہ زندگی جس کی رگ رگ میں بد اخلاقی کی روح سرایت کیے ہوئے ہو۔ خدا پرستی سے پیدا ہونے والے اخلاق اور شرک، دہریت یا مادہ پرستی سے پیدا ہونے والے اخلاق یکساں نہیں ہو سکتے۔ زندگی کے یہ سب نظریے اپنے الگ الگ مزاج رکھتے ہیں اور ہر ایک کا مزاج دوسرے سے مختلف قسم کے اخلاقیات کا تقاضا کرتا ہے۔ پھر جو اخلاق خدا پرستی سے پیدا ہوتے ہیں وہ صرف ایک خاص عابد و زاہد گروہ کے لیے مخصوص نہیں ہیں کہ صرف خانقاہ کی چار دیواری اور عزلت کے گوشے ہی میں ان کا ظہور ہو سکے۔ ان کا اطلاق وسیع پیمانے پر پوری انسانی زندگی میں اور اس کے ہر ہر پہلو میں ہونا چاہیئے۔ اگر ایک تاجر خدا پرست ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی تجارت میں اس کا خدا پرستانہ اخلاق ظاہر نہ ہو۔ اگر ایک جج خدا پرست ہے تو عدالت کی کرسی پر، اور ایک پولیس مین خدا پرست ہے تو پولیس پوسٹ پر اس سے غیر خدا پرستانہ اخلاق ظاہر ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ اور اسی طرح اگر کوئی قوم خدا پرست ہے تو اس کی شہری زندگی میں، اس کے انتظامِ ملکی میں، اس کی خارجی سیاست میں اور اس کی صلح و جنگ میں خدا پرستانہ اخلاق کی نمود ہونی چاہیئے ورنہ اس کا ایمان باللہ محض ایک لفظِ بے معنی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ خدا پرستی کس قسم کے اخلاق کا تقاضا کرتی ہے اور اُن اخلاقیات کا ظہور کس طرح انسان کی عملی زندگی میں، اور انفرادی و اجتماعی رویہ میں ہونا چاہیئے، تو یہ ایک وسیع مضمون ہے جسے ایک مختصر گفتگو میں سمیٹنا مشکل ہے۔ مگر میں نمونے کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات آپ کو سنائے دیتا ہوں جن سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ آنحضرت کے مرتب کیے ہوئے نظامِ زندگی میں ایمان، اخلاق اور عمل کا امتزاج کس نوعیت کا ہے۔ سنیئے حضور کیا فرماتے ہیں:۔

الایمان بضع وسبعون شعبة فافضلها قول لا اله الا الله وادناها اماطة الاذى عن الطريق والحياء شعبة من الایمان

ایمان کے بہت سے شعبے ہیں۔ اس کی جڑ یہ ہے کہ تم خدا کے سوا کسی کو معبود نہ مانو، اور اس کی آخری شاخ یہ ہے کہ راستے میں کوئی ایسی چیز ہو جو چلنے والوں کو تکلیف دینے والی ہو تو اسے ہٹا دو۔ اور حیا بھی ایمان ہی کا ایک شعبہ ہے۔

الطہور شطر الایمان

جسم و لباس کی پاکیزگی آدھا ایمان ہے۔

المومن من امنه الناس على دمائهم واموالهم

مومن وہ ہے جس سے لوگوں کو اپنی جان و مال کا کوئی خطرہ نہ ہو۔

لا ایمان لمن لا امانة له ولا دين لمن لا عهد له

اس شخص میں ایمان نہیں ہے جس میں امانت داری نہیں اور وہ شخص بے دین ہے جو عہد کا پابند نہیں۔

اذا سرتك حسنتك وساءتك سيئتك فانت مومن

جب نیکی کر کے تجھے خوشی ہو اور برائی کر کے تجھے پچھتاوا ہو تو تو مومن ہے۔

الایمان الصبر والسماحة

ایمان تحمل اور رواداری کا نام ہے۔

افضل الایمان ان تحب لله وتبغض لله وتعمل لسانك في ذكر الله وان تحب للناس ما تحب لنفسك وتكره لهم ما تكره لنفسك

بہترین ایمانی حالت یہ ہے کہ تیری دوستی اور دشمنی خدا کے واسطے ہو، تیری زبان پر خدا کا نام جاری ہو اور تو دوسروں کے لئے وہی کچھ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے اور دوسروں کے لئے وہی کچھ ناپسند کرے جو اپنے لئے ناپسند کرتا ہے۔

اكمل المؤمنين ايمانا احسنهم خلقا والطفهم باهله

تم میں سب سے زیادہ کامل الایمان اس شخص کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں اور جو اپنے گھر والوں پر سب سے زیادہ مہربان ہے۔

من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره

جو شخص خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے اپنے مہمان کی عزت کرنی چاہئے، اپنے ہمسائے کو تکلیف

ومن کان یومن باللّٰہ والیوم الآخر فلیقل خیراً او لیصمت	نہ دینی چاہیئے، اور اس کی زبان کھلے تو بھلائی پر کھلے ورنہ چپ رہے۔
لیس المؤمن بالطعان ولا باللعان ولا الفاحش ولا البذی	مومن کبھی طعنے دینے والا، لعنت کرنے والا، بدگو اور زبان دراز نہیں ہوا کرتا۔
یطبع المؤمن علی الخلال کلہا الا الخیانۃ والکذب	مومن سب کچھ ہو سکتا ہے مگر جھوٹا اور خائن نہیں ہو سکتا
واللّٰہ لایومن واللّٰہ لایومن واللّٰہ لایومن الذی لایامن جارہ بوائقہ	مومن نہیں ہے خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے جس کی بدی سے اس کا ہمسایہ امن میں نہ ہو۔
لیس المؤمن بالذی یشبع وجارہ جائع الی جنبہ	جو شخص خود پیٹ بھر کھالے اور اس کے پہلو میں اس کا ہمسایہ بھوکا رہ جائے وہ ایمان نہیں رکھتا۔
من کظم غیظاً وھو یقدر علی ان ینفذہ ملأ اللّٰہ قلبہ امناً وایماناً	جو شخص اپنا غصہ نکال لینے کی طاقت رکھتا ہو لیکن ضبط کر جائے اس کے دل کو خدا ایمان سے لبریز کر دیتا ہے
من مشی مع ظالم لیقویہ وھو یعلم انہ ظالم فقد خرج من الاسلام	جو شخص کسی ظالم کو ظالم جانتے ہوئے اس کا ساتھ دے وہ اسلام سے نکل گیا۔
من صلی یرائی فقد اشرک ومن صام یرائی فقد اشرک ومن تصدق یرائی فقد اشرک	جس نے لوگوں کو دکھانے کے لئے نماز پڑھی یا روزہ رکھا یا خیرات کی اس نے خدائی میں لوگوں کو شریک کیا
اربع من کن فیہ کان منافقاً خالصاً۔ اذا ائتمن خان واذا حدث کذب واذا عاھد غدر واذا خاصم فجر	خالص منافق ہے وہ شخص جو امانت میں خیانت کرے بولے تو جھوٹ بولے، عہد کرے تو اسے توڑ دے اور لڑے تو شرافت کی حد سے گزر جائے۔
عدلت شھادۃ الزور بالاشراک باللّٰہ	جھوٹی گواہی اتنا بڑا گناہ ہے کہ شرک کے قریب جا پہنچتا
المجاھد من جاھد نفسہ فی طاعۃ اللّٰہ والمھاجر من ھجر ما نھی اللّٰہ عنہ	اصلی مجاہد وہ ہے جو خدا کی فرمانبرداری میں خود اپنے نفس سے لڑے اور اصلی مہاجر وہ ہے جو ان کاموں

کو چھوڑے جنہیں خدا ناپسند کرتا ہے۔

اتدرون من السابقون الی ظل اللہ عز وجل یوم القیمۃ قالوا اللہ ورسولہ اعلم قال الذین اذا اعطوا الحق قبلوہ واذا سئلوہ بذلوہ وحکموا للناس کحکمھم لانفسھم

قیامت کے روز خدا کے سایے میں سب سے پہلے جگہ پانے والے وہ لوگ ہونگے جن کا حال یہ رہا کہ جب بھی حق ان کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے مان لیا، اور جب بھی حق ان سے مانگا گیا تو انہوں نے کھلے دل سے دیا، اور دوسروں کے معاملہ میں انہوں نے وہی فیصلہ کیا جو وہ خود اپنے معاملے میں چاہتے تھے

اضمنوا لی ستا من انفسکم اضمن لکم الجنۃ اصدقوا اذا حدثتم واوفوا اذا وعدتم وادوا اذا ائتمنتم واحفظوا فروجکم وغضوا ابصارکم وکفوا ایدیکم

تم چھ باتوں کی ضمانت دو، میں تمہارے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ بولو تو سچ بولو، وعدہ کرو تو وفا کرو، امانت میں پورے اترو، بدکاری سے پرہیز کرو، بدنظری سے بچو، اور ظلم سے ہاتھ روکو۔

لا یدخل الجنۃ خبٌ ولا بخیل ولا منان۔

دھوکہ باز اور بخیل اور احسان جتلانے والا آدمی جنت میں نہیں جا سکتا۔

لا یدخل الجنۃ لحم نبت من السحت وکل لحم نبت من السحت فالنار اولی بہ

جو جسم حرام کی کمائی سے پلا ہو اس کے لیے تو دوزخ کی آگ ہی زیادہ موزوں ہے جنت میں وہ نہیں جا سکتا۔

من باع عیبا لم یبینہ لم یزل فی مقت اللہ ولم تزل الملئکۃ تلعنہ

جس شخص نے عیب دار چیز بیچی اور خریدار کو عیب سے آگاہ نہ کیا اس پر خدا کا غصہ بھڑکتا رہتا ہے اور فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔

لو ان رجلا قتل فی سبیل اللہ ثم عاش ثم قتل فی سبیل اللہ ثم عاش، ثم قتل فی سبیل اللہ ثم عاش وعلیہ دین ما دخل الجنۃ حتی یقضی دینہ

کوئی شخص خواہ کتنی ہی بار زندگی پائے اور خدا کی راہ میں جہاد کر کے جان دیتا رہے مگر وہ جنت میں نہیں جا سکتا اگر اس نے کسی کا قرض لیکر ادا نہ کیا ہو۔

ان الرجل لیعمل والمرأۃ بطاعۃ اللہ ستین سنۃ ثم

ایک شخص ۶۰ برس خدا کی عبادت کرتا ہے اور مرتے وقت

يحضرهما الموت فيضاران في الوصية فتجب لهما النار۔

ایک وصیت میں حق دار کی حق تلفی کر کے اپنے آپ کو دوزخ کا مستحق بنا لیتا ہے۔

لا يدخل الجنة سيئ الملكة

وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جو اپنے ماتحتوں پہ بری طرح افسری کرے۔

الا اخبركم بافضل من درجة الصيام والصدقة والصلاة؟ اصلاح ذات البين وافساد ذات البين هي الحالقة۔

میں نہیں بتاؤں کہ روزے اور خیرات اور نماز سے بھی افضل کیا چیز ہے؟ وہ ہے بگاڑ میں صلح کرانا۔ اور لوگوں کے باہمی تعلقات میں فساد ڈالنا وہ فعل ہے جو تمام نیکیوں پہ پانی پھیر دیتا ہے۔

ان المفلس من امتي من ياتي يوم القيامة بصلاة وصيام وزكاة ويأتي وقد شتم هذا وقذف هذا واكل مال هذا وسفك دم هذا وضرب هذا فيعطى هذا من حسناته وهذا من حسناته فان فنيت حسناته قبل ان يقضى ما عليه اخذ من خطاياهم فطرحت عليه ثم طرح في النار

اصلی مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز خدا کے حضور اس حال میں حاضر ہو کہ اس کے ساتھ نماز روزے زکوٰۃ سب کچھ ہے مگر وہ کسی کو گالی دے کر آیا تھا، کسی پر بہتان لگا کر آیا تھا، کسی کا مال مار کھایا تھا کسی کا خون بہایا تھا اور کسی کو پیٹ کر آیا تھا۔ پھر اس کی ایک ایک نیکی ان مظلوموں پر بانٹ دی اور ان مظلوموں کا ایک ایک قصور اس کے حساب میں ڈالا اور اس کے پاس کچھ نہ بچا جو اسے دوزخ سے بچا لیتے۔

لن يهلك الناس حتى يعذروا من انفسهم

لوگ نجات سے محروم نہ ہوں گے جب تک اپنی برائیوں کی تاویلیں کر کر کے اپنے نفس کو مطمئن نہ کریں۔

المحتكر ملعون

جو تاجر قیمتیں چڑھانے کے لیے مال روک رکھے وہ ملعون ہے۔

من احتكر طعاما اربعين يوما يريد به الغلاء فقد برئ من الله وبرئ الله منه۔

جس نے چالیس دن غلہ اس لئے روکے رکھا کہ قیمتیں چڑھ جائیں تو خدا کا اس سے اور اس کا خدا سے کوئی

... اس کی طاقت اس عجیب دیتا تو تصدق بہ لم تعلق نہیں۔ پھر اگر وہ اس خلا کو حیران ہی کر دے
میں لم یکن ... تو معاف نہ کیا جائے گا

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار اقوال میں سے چند ہیں جو میں نے محض نمونے کے طور پر آپ کے سامنے پیش کئے ہیں۔ ان سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ حضورؐ نے ایمان سے اخلاق کا اور پھر اخلاق سے زندگی کے تمام شعبوں کا تعلق کس طرح قائم کیا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ آپ نے اس چیز کو صرف باتوں کی حد تک نہ رکھا بلکہ عمل کی دنیا میں ایک پورے ملک کے نظام تمدن و سیاست کو انہی بنیادوں پر قائم کر کے دکھا دیا اور آپ کا یہی وہ کارنامہ ہے جس کی بنا پر آپ نوع انسانی کے سب سے بڑے رہنما ہیں۔

(باجازت وشکریہ ریڈیو پاکستان)

ہماری نئی زیر طبع مطبوعات

۱۔ **سود** اس کتاب میں مدیر ترجمان نے سود، بینکنگ، انشورنس وغیرہ کی حقیقت و ماہیت پر بحث کی ہے۔ نیز جدید معاشی نظریات اور مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کی ہے۔ ضخامت ۳۰۰ صفحات قیمت ...

۲۔ **الجہاد فی الاسلام** یہ کتاب عرصے سے نایاب و غیر مطبوع تھی۔ اب اسے دوبارہ چھپوایا جا رہا ہے۔

۳۔ **منہاج الانقلاب الاسلامی** ۔ یہ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے کا عربی ترجمہ ہے جو مولانا مسعود عالم ندوی نے کیا ہے۔ ضخامت ۴۰ صفحات قیمت ...

۴۔ **الدین القیم** ۔ یہ دین حق کا عربی ترجمہ ہے جو مترجم موصوف نے ہی کیا ہے۔ ضخامت ۴۰ صفحات قیمت ...

۵۔ **نظریۃ الاسلام السیاسی** یہ اسلام کا نظریہ سیاسی کا عربی ترجمہ ہے جو چھپ چکا ہے۔ ضخامت ۴۰ صفحات ...

۶۔ **تفہیمات** جلد دوم طبع ہو رہی ہے۔ قیمت ...

مکتبہ جماعت اسلامی، اچھرہ، لاہور

پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیے

۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو ریڈیو پاکستان لاہور سے ایک مباحثہ نشر ہوا تھا جس میں مذکورۂ بالا عنوان زیرِ بحث تھا۔ اس مباحثہ میں سائل کی حیثیت سے جناب وجیہ الدین صاحب بول رہے تھے اور مجیب کی حیثیت سے ابوالاعلیٰ مودودی۔ ذیل میں یہ مباحثہ ریڈیو پاکستان کی اجازت اور شکریہ کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے!

س:۔ اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے غالباً یہ جان لینا ضروری ہے کہ آپ کے ذہن میں مذہبی ریاست کا کیا تصور ہے۔

م۔ ظاہر بات ہے کہ ایک مسلمان جب مذہب کا لفظ بولے گا تو اس کے ذہن میں اسلام ہی مراد ہوگا۔ میں جب کہتا ہوں کہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیئے تو اس سے میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے ایک اسلامی ریاست ہونا چاہیئے، یعنی ایک ایسی ریاست جو اخلاق، تہذیب، تمدن، معاشرت، قانون، سیاست اور معیشت کے اُن اصولوں پر قائم ہو جو اسلام نے ہم کو دیے ہیں۔

س:۔ آپ نے مذہبی ریاست کا جو مفہوم بیان فرمایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ریاست کا سیاسی اقتدار ماہرینِ دینیات کے ایک مخصوص طبقے کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس طبقہ کا کام یہ ہوگا کہ وہ سیاسی اور انتظامی امور کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے تحقیق و تفتیش کرے، ریاستی قوانین وضع کرے اور شرعی احکامات کی بنا پر ہر سیاسی گتھی کو سلجھائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طبقے کی پشت پناہ کون لوگ ہوں گے؟ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اقتصادی لحاظ سے ہماری سماج مختلف طبقوں میں منقسم ہے۔ ہر طبقہ اس کوشش میں ہے کہ اپنے مفاد کے حصول کے لئے مذہبی جواز تلاش کرے اور مذہبی نعروں کو استعمال میں لائے۔ ماہرینِ دینیات اس طبقاتی کشمکش سے بے نیاز اور غیر متعلق نہیں رہ سکتے۔ اُن کے لئے لازم ہے کہ یا تو وہ عوامی طاقتوں کا ساتھ دیں، یا اپنے آپ کو سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ سے وابستہ کریں۔ اس صورت میں قرآنی اصولوں کی جو بھی تفسیر پیش کی جائیگی وہ اُن کے سیاسی رجحان کی آئینہ دار

ہوگی۔ مختلف سیاسی خیالات رکھنے والے مفسروں میں اہم ترین مسائل پر شدید ترین اختلاف رائے پیدا ہو جائیگا۔ اقتصادی کشمکش ایک لا متناہی فقیہانہ بحث کی صورت اختیار کر لیگی۔ اور وہ مسائل جن کا مناسب حل ڈھونڈنا اس وقت اشد ضروری ہے جوں کے توں دھرے کے دھرے رہ جائینگے۔

م:۔ جس طبقاتی کشمکش کی طرف آپ اشارہ فرما رہے ہیں وہ در اصل پیدا ہی اس لئے ہوئی ہے کہ مدتوں سے غیر اسلامی اثرات کے تحت رہتے رہتے ہمارا معاشرہ اخلاق کی اس روح سے اور انصاف کے ان اصولوں سے محروم ہوگیا ہے جو اسلام نے ہم کو دئے تھے۔ جس مادہ پرستی نے دنیا کے دوسرے معاشروں کو طبقات میں تقسیم کیا اور ان کے اندر اغراض و مفاد کا تصادم پیدا کیا، وہی بدقسمتی سے اب ہمارے معاشرے کو پھاڑنے اور باہم ٹکرا دینے کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ ابھی ابھی ہم فرقہ وارانہ کشاکش کے ہولناک نتائج بھگت چکے ہیں اور اس سے لگے ہوئے زخم ابھی بھرے بھی نہیں ہیں۔ اب ہم اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ اپنے آپ کو ان اجتماعی فلسفوں کے حوالے کر دیں جو ہمارے اندر ایک دوسری جنگ ——— طبقاتی جنگ ——— برپا کر دیں اور ہمیں اس وقت تک امن کی صورت نہ دیکھنے دیں جب تک ہمارا کوئی ایک طبقہ دوسرے طبقوں کو ملیامیٹ نہ کر دے۔ دوسری قوموں نے تو ان اجتماعی فلسفوں کو شاید اس لئے قبول کر لیا کہ ان کے پاس اخلاق اور انصاف کے وہ اصول موجود نہ تھے جو طبقاتی خود غرضی کے نشوونما کو روک سکتے اور مختلف عناصر کو ایک عادل برادری میں جمع کر دیتے۔ لیکن ہم خوش قسمتی سے ایک ایسا نظام حیات رکھتے ہیں جو ہمیں اس خطرے سے بچا سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم اپنے اندر سے ان لوگوں کو ابھاریں جو اسلام کی روح کو پوری طرح سمجھتے ہوں اور طبقاتی تعصبات سے بالاتر ہو کر اسلام کے قوانین کی بے لاگ تعبیر کر سکتے ہوں۔ پھر یہ لوگ بالاتفاق یا اکثریت کے ساتھ جو تعبیر ہمارے سامنے پیش کریں اسے ہم سب مان لیں اور ہم میں سے کوئی طبقہ اپنے ہی مطلب کی تعبیر لینے پر اصرار نہ کرے۔ ایسے لوگوں کی حیثیت پناہی پوری قوم کو بحیثیت مجموعی کرنی چاہیئے نہ کہ کسی ایک طبقے یا چند طبقوں کو۔ ہمیں ان کے انتخاب میں صرف اس معیار کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ وہ بھروسے کے قابل سیرت رکھتے ہوں اور اسلام کی صحیح تعبیر کرنے کے اہل ہوں۔

س:- میری ناچیز رائے میں سیاسی نظام کے مرتب کرنے میں بصرف خلوص اور ایمانداری ہی سے کام نہیں چل سکتا۔ ہمارے سامنے اس وقت بہت سے پیچیدہ سیاسی اور معاشی مسائل ہیں جن پر سنجیدہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت قرار دیا جائے یا شخصی ملکیت؟ ریاست میں ایک ہی سیاسی پارٹی ہونی چاہیئے یا ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیوں کا ہونا جمہوریت کو برقرار رکھنے کے لیئے ضروری ہے؟ مزدوروں کو ہڑتال کا حق ہونا چاہیئے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ آپ ان گتھیوں کو مذہبی پیشواؤں کے حوالہ کر دیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ کسی فیصلہ کن نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ریاست کی تعمیر کے لیئے فقیہانہ تحقیق و تجسس اور مذہبی کتب کی چھان بین کے بجائے سیاسی تجربے اور تاریخی شعور کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں دینیات کے ماہروں کی بہ نسبت سیاسیات اور اقتصادیات کے ماہرین ہماری بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں۔

ج:- آپ جب "دینیات" کا لفظ بولتے ہیں تو شاید "دنیویات" کو اس سے خارج کر دیتے ہیں۔ اسی لئے آپ کو بجا طور پر یہ اندیشہ ہوا کہ اگر ہم نے اپنے سیاسی اور معاشی مسائل کا حل ان ماہرین دینیات کے حوالہ کر دیا جو دنیویات سے ناواقف ہیں تو ہمارا کوئی مسئلہ بھی حل نہ ہو سکے گا۔ لیکن آپ ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمائیں کہ اگر ہم نے اپنے تمدن، اپنی سیاست اور اپنی معیشت کے مسائل ان ماہرین کے حوالہ کیئے جو صرف مغربی نظریات و عملیات سے واقف ہیں اور اسلامی تعلیمات سے کوئی مس نہیں رکھتے تو ہم کہاں پہنچیں گے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ماہرین دینیات کی بہ نسبت ہماری بہتر رہنمائی کر سکیں گے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ رہنمائی ہمیں اسی منزل پر لے جائیگی جس پر آج دنیا کی بڑی بڑی قومیں پہنچ چکی ہیں یعنی گھر کے اندر طبقاتی خود غرضیوں کی کشاکش، اور گھر کے باہر بین الاقوامی خود غرضیوں کی کھینچ تان۔ کیا اس سے بہتر یہ نہ ہوگا کہ ہم اپنی قوم میں ایسے لوگوں کو تلاش کریں جو دین اور دنیا دونوں کو اچھی طرح جانتے ہوں، جن کی نگاہ قرآن و حدیث کی تعلیمات پر اور سیاسیات و معاشیات وغیرہ کے مسائل پر یکساں ہو، اور وہ سر جوڑ کر ہماری گتھیوں کا ایسا حل پیش کریں جو ہماری قومی زندگی کو سارے دنیا کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ بنا دے؟

۳۔ ریاست پاکستان کو اسلامی شریعت کے مطابق تنظیم دینے اور شرعی احکامات کا موجودہ حالات پر اطلاق کرنے میں ہمیں ایک اور مشکل پیش آئیگی۔ ہم بسا اوقات مذہبی احکامات کی روح کو فراموش کر دیتے ہیں اور ان کی لفظی حیثیت ہمارے پیش نظر رہتی ہے۔ اس طرح وسائل اور مقاصد ایک دوسرے سے خلط ملط ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سود ہی کو لیجیئے۔ سود کو ناجائز قرار دینے کا مقصد یہی تھا کہ اقتصادی استحصال کو روکا جائے۔ اسی طرح اجارہ، احتکار اور چور بازاری کی مخالفت کی گئی۔ لیکن جائز تجارت کو روا رکھا گیا۔ کیونکہ اس زمانے میں سرمایہ داری نظام ابھی طفولیت کی حالت میں تھا اور صنعتی سرمایہ کی طرح ظلم و استبداد کا آلہ نہ تھا۔ آج حالات بدل چکے ہیں۔ آج بیرونی تجارت کا مفہوم یہ ہے کہ سامراجی نظام کو تقویت دی جائے اور دوسری قوموں کو اقتصادی اور سیاسی طور پر محکوم بنایا جائے۔ جائز اور ناجائز تجارت کا فرق مٹ چکا ہے۔ لیکن ہمارے علماء جب اقتصادیات پر فتویٰ لگاتے ہیں تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ موجودہ اقتصادی نظام میں مہاجنی سود کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ غربت اور بدحالی اس شے کی پیداوار ہے جسے وہ جائز قرار دیتے ہیں، یعنی صنعتی سرمایہ داری اور بینکنگ۔

۴:۔ یہ خرابی جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں ہر اس جگہ پیدا ہو جاتی ہے جہاں قانون کے منشا اور اس کی روح کو چھوڑ کر صرف اس کے الفاظ لے لئے جاتے ہیں۔ کہیں یہ خرابی علم اور بصیرت کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور کہیں اس وجہ سے کہ لوگ اپنی اغراض کے لیے قانون کی روح سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں مگر ظاہرداری کو قائم رکھنے کے لئے قانون کی شکل بدلنے سے احتراز کرتے ہیں۔ ہمیں اس خرابی سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ عام مسلمانوں میں اسلام کا شعور اور اس کی واقعی پیروی کا ارادہ موجود ہو۔ یہ چیز جب موجود ہو گی تو وہ اسلامی قوانین کی تعبیر کے لئے اپنے اندر سے انہی لوگوں کو منتخب کرینگے، جو قرآن و سنت کے محض الفاظ ہی نہ جانتے ہوں بلکہ ان کی روح کو بھی سمجھتے ہوں۔

س ۵:۔ شریعت کے مفسرین اور شارحین میں سیاسی اختلافات کے علاوہ جو خالصتہً مذہبی اختلافات

بہ اُن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، کیا آپ کی نظر میں یہ اختلافات مستقبل کے سیاسی اور ...جی نظام کا تصور قائم کرنے میں رکاوٹ نہ ڈالینگے؟

م:۔ ان اختلافات کی نوعیت وہی کچھ ہے جو ہمارے دوسرے اختلافات کی ہے اور انہیں بھی ہم اسی طرح حل کر سکتے ہیں جس طرح دوسرے اختلافات کو حل کیا کرتے ہیں۔ کوئی معاشرہ جو انسانوں پر مشتمل ہو ایسا نہیں ہو سکتا جس میں زندگی کے مختلف مسائل سے متعلق مختلف نظریے نہ پائے جاتے ہوں۔ لیکن ان اختلافات کو کہیں بھی ایسی رکاوٹ بننے کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ زندگی کی گاڑی آگے چلنے ہی نہ دیں۔ ... ت کو حل کرنے کا جمہوری طریقہ یہ ہے کہ ریاست کا نظام اس نقطۂ نظر کے ... چلایا جائے جس کو اکثریت قبول کرتی ہو اور قلیل التعداد گروہ ... کے نقطۂ نظر کی زیادہ سے زیادہ ... بت کی جائے جس کی اصول پر گنجائش ہو، نیز اقلیت کی حیثیت سے ان کے حقوق کا منصفانہ تحفظ کیا جائے۔ ہم کوشش کرینگے کہ پاکستان کی ریاست اسلام کے ان وسیع ترین اصولوں پر قائم ہو جن پر مسلمانوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اتفاق پایا جاتا ہے۔ تاہم کچھ ایسے گروہ باقی رہ سکتے ہیں جو ان وسیع ترین اصولوں میں بھی اکثریت کے ساتھ متفق نہ ہوں۔ اس صورت میں ہم کو وہی جمہوری طریقہ اختیار کرنا پڑیگا جس کا ابھی ... ذکر کر چکا ہوں ... یہ بالکل ایک عجیب بات ہوگی کہ ہم سب غیر اسلام پر اس لئے اتفاق کر لیں کہ اسلام ... نہ ہو سکے۔

س:۔ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کے علاوہ ریاست پاکستان میں اقلیتوں کا مسئلہ بھی قابل غور ہے۔ آپ کس طرح اُن کو اس بات پر راضی کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی ریاست کا قیام گوارا کرلیں ... کے وفادار رہیں؟

... گتھی کا حل بھی وہی ہے جو مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کا ہے۔ جمہوری طریقہ یہ ایک ملک ... ہی اصولوں کے مطابق بنتا اور چلتا ہے جو اکثریت کی رائے میں صحیح ہوں۔ اقلیت یہ مطالبہ ضرور کر ... ہے کہ اُس کے نقطۂ نظر پر بھی غور کیا جائے، نیز یہ کہ اُس کے حقوق شہریت اور اس ... کو محفوظ رکھا جائے۔ لیکن انصاف کی رو سے وہ یہ مطالبہ نہیں کر سکتی کہ اکثریت اُس کی خاطر اپنی رائے بدل دے۔

اس ملک کی اکثریت ایمانداری کے ساتھ یہ رائے رکھتی ہے کہ اسلام کے اصولوں کی پیروی میں پاکستان کے باشندوں کی فلاح ہے۔ اس کو یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ ملک کا نظام اس کی اس رائے کے مطابق ہو۔ اقلیت اس سے اپنے حقوق کا تحفظ مانگ سکتی ہے۔ مگر یہ کہنے کا اسے حق نہیں ہے کہ اکثریت اسلام کے بجائے کچھ دوسرے اصولوں میں اپنی فلاح تلاش کرے۔ رہا رواداری کا سوال، تو حقیقت یہ ہے کہ رواداری کا تعلق کسی ریاست کے مذہبی یا غیر مذہبی ہونے سے نہیں ہے، بلکہ وہ اس انصاف، شرافت اور فیاضی پر منحصر ہے جو اکثریت کی طرف سے اقلیت کے ساتھ برتی جائے۔ آپ اقلیت کو محض اس دعوے کا یقین نہیں کرا سکتے کہ دیکھو ہم نے تمہاری خاطر اپنے مذہب کو چھوڑ دیا اور ایک غیر مذہبی ریاست بنالی۔ اقلیت یہ دیکھے گی کہ آپ اس کے ساتھ انصاف کرتے ہیں یا نہیں۔ آپ کا برتاؤ تعصب اور تنگ دلی پر مبنی ہے یا رواداری اور فیاضی پر۔ یہی تجربہ دراصل فیصلہ کرے گا کہ اقلیت کو اس ریاست میں وفادار بن کر رہنا ہے یا بیزار بن کر۔

(۱) س: میری رائے میں ہر ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کے رسم و رواج، اخلاقی عادات و معمولات اور اعتقادات و توہمات کا پرتو ہوتا ہے۔ ریاستی نظام بجائے خود کسی فلسفے یا مذہب کا حامل نہیں ہو سکتا۔ اگر اسے ایسا بنانے کی کوشش کی جائے تو یہ ایک مصنوعی اور عارضی کوشش ہوگی۔ قدیم یونان کی شہری ریاست افلاطون کے تخیل کی پیداوار نہیں تھی کیونکہ اس انداز فکر اور فلسفہ زندگی کی پیداوار تھی جو یونان کے باشندوں میں مشترک تھا۔ اسی طرح اگر ہم اسلامی ریاست کی تعمیر چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ پاکستان کے باشندوں میں صحیح اسلامی سیرت پیدا کریں اور انہیں دین کی اصلی اقدار سے روشناس کرائیں۔ جب یہ اقدار ان کی جان بن جائیں گی اور ان کی زندگی میں اسلامی تصورات پوری طرح سرایت کر جائیں گے، اس وقت ہمارا سیاسی نظام خود بخود اسلامی رنگ اختیار کر لے گا۔ ہم اس وقت تک اسلامی ریاست کی داغ بیل نہیں ڈال سکتے جب تک ہماری روحانی، شخصی اور سماجی زندگی میں اسلامی روایات پوری تابندگی سے جلوہ گر نہ ہوں۔ میری رائے میں وہ وقت ابھی بہت دور ہے جب ہم مکمل طور پر اسلامی تصورات کو قبول کر لیں گے۔ اس لیے اسلامی ریاست کو قائم کرنے کی تمام کوششیں قبل از وقت ہیں۔ ہماری بنیادیں ابھی اتنی استوار نہیں ہیں کہ ہم ان پر ایک عم

گھڑی کر سکیں۔

م:۔ آپ نے صحیح فرمایا کہ ایک ملک کا سیاسی نظام اُس کے باشندوں کی اخلاقی اور ذہنی حالت کا پرتو ہوا کرتا ہے۔ اب اگر پاکستان کے باشندے اسلام کی طرف ایک پرزور میلان رکھتے ہیں اور اُن کے اندر اسلام کے راستے پر آگے بڑھنے کی خواہش موجود ہے تو کیوں نہ ان کی قومی ریاست اُن کے اس میلان اور اس خواہش کا پرتو ہو؟ آپ کا یہ ارشاد بھی بالکل درست ہے کہ اگر ہم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں پاکستان کے باشندوں میں اسلامی شعور، اسلامی ذہنیت اور اسلامی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مگر میں نہیں سمجھا کہ اس کوشش میں حصہ لینے سے آپ خود ریاست کو کیوں مستثنیٰ رکھنا چاہتے ہیں۔ ۱۵ اگست ۴۷ء سے پہلے کی صورت حال تو یہ تھی کہ ہمارے اوپر ایک غیر مسلم اقتدار مسلط تھا۔ اس وجہ سے ہم اسلامی خطوط پر اپنی ملت کی تعمیر میں ریاست اور اس کی طاقتوں اور اس کے ذرائع سے کوئی مدد نہیں پا رہے تھے، بلکہ درحقیقت اُس وقت ریاست کا پورا ادارہ اپنے زور سے ہمیں ایک دوسری طرف کھینچے لئے جا رہا تھا اور ہم انتہائی ناسازگار حالت میں اسلامی زندگی کی تعمیر کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ اب جو سیاسی انقلاب ۱۵ اگست کو رونما ہوا ہے اس کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا اب ہماری قومی ریاست اسلامی زندگی کی تعمیر میں وہ حصہ لیگی جو ایک معمار کا حصہ ہوتا ہے؟ یا وہ طرزِ عمل اختیار کریگی جو ایک بے نیاز غیر جانبدار کا ہوا کرتا ہے؟ یا اب بھی وہی پچھلی صورت حال برقرار رہیگی کہ ہمیں حکومت کی مدد کے بغیر ہی نہیں بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اسلامی تعمیر کا کام کرنا ہوگا؟ اس وقت چونکہ پاکستان کا آئندہ نظام زیرِ تشکیل ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ایسی ریاست بن جائے جو اسلامی زندگی کی معمار بن سکے ہماری یہ خواہش اگر پوری ہو گئی تو ریاست کے وسیع ذرائع اور طاقتوں کو استعمال کر کے پاکستان کے باشندوں میں ذہنی اور اخلاقی انقلاب برپا کرنا بہت زیادہ آسان ہو جائیگا، پھر جس نسبت سے ہمارا معاشرہ بدلتا جائیگا اُسی نسبت سے ہماری ریاست بھی ایک مکمل اسلامی ریاست بنتی چلی جائیگی۔

رسائل و مسائل!

حلفِ وفاداری

مغربی پنجاب کی حکومت نے اپنے قواعد ملازمت میں جو تازہ ترمیم کی ہے اس کی رُو سے ہر سرکاری ملازم کو خواہ وہ پہلے سے ملازم ہو یا اب ملازمت میں داخل ہو، حسبِ ذیل حلف اٹھانا پڑے گا:۔

"میں خوب سوچ سمجھ کر یہ قسم کھاتا ہوں (یا اقرار کرتا ہوں) کہ میں پاکستان کے دستورِ حکومت کا جیسا کہ وہ از روئے قانون قائم ہے سچے دل سے وفادار اور مخلص ہوں، اور یہ کہ میں اپنی قابلیت، علم اور سلیقے کے مطابق زیادہ سے زیادہ اخلاص و دیانت کے ساتھ اپنے منصب کے فرائض انجام دوں گا۔"

اس حلف کے پہلے جزء سے سرکاری ملازموں کا ایک کثیر طبقہ غیر مطمئن ہے اور انہیں یہ شبہ ہے کہ آیا ایک مسلمان ایمانداری کے ساتھ موجودہ غیر اسلامی دستور کی وفاداری کا حلف اٹھا سکتا ہے؟ براہِ کرم اس معاملہ میں ہماری رہنمائی فرمائیے۔

اس مضمون کے سوالات متعدد جگہوں سے ہمارے پاس آئے ہیں۔ انفرادی طور پر ہر ایک کو الگ جواب دینا مشکل ہے۔ لہٰذا اِن صفحات میں سب کو ایک جامع جواب دیا جاتا ہے۔

یہ فیصلہ کرنا کہ کوئی سرکاری ملازم یا ملازمت کا امیدوار یہ حلف لے یا نہ لے ہمارا کام نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ تو ہر اس شخص کو خود ہی کرنا چاہئے جس کے سامنے یہ سوال فیصلہ طلب ہو اور اپنے ضمیر سے پوچھے کہ آیا اس حلف نامے کے ساتھ اسے ملازمت قبول ہے یا نہیں۔ ہم اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو وہ صرف موجودہ دستور اور اس کے حلفِ وفاداری کی اصولی حیثیت واضح کرنے کی حد تک ہی ممکن ہے۔

موجودہ دستور کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ وہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ پر مبنی ہے۔ اصولاً یہ ایک بے دین

حکومت کا دستور ہے جس میں خدا کی حاکمیت تسلیم کی گئی ہے اور رسول کی لائی ہوئی شریعت کو ماخذ قانون مانا گیا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان کہتے ہی اس شخص کو ہیں جو کلمۂ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کر کے خدا کی حاکمیت تسلیم کر چکا ہو اور شریعت محمدی کو اپنے لئے قانون کا واحد ماخذ مان چکا ہو۔ اب ہر صاحب عقل آدمی خود ہی سمجھ سکتا ہے کہ ایک انسان بیک وقت ان دو متضاد چیزوں کا سچے دل سے قائل کیسے ہو سکتا ہے اگر وہ اس لادینی دستور کو حق مانتا ہے تو کلمۂ توحید و رسالت کی تردید لازم آتی ہے اور اگر وہ کلمۂ توحید و رسالت کو حق سمجھتا ہے تو ممکن نہیں ہے کہ اس کے ساتھ وہ اس دستور کو بھی حق سمجھے جو قطعی طور پر اس کلمہ کی ضد ہے۔ پھر آخر یہ بات کس طرح معقول ہو سکتی ہے کہ ایک مسلمان بیک وقت سچا مسلمان بھی ہو اور سچے دل سے اس لادینی دستور کا مخلص وفادار بھی۔ وہ اس بات کا حلف تو ضرور لے سکتا ہے کہ جس حکومت سے وہ تنخواہ لیتا ہے اس کے عاید کردہ فرائض کو دیانت اور فرض شناسی سے انجام دیگا اور اس بات کا حلف بھی لے سکتا ہے (بلکہ اسے لینا چاہئے) کہ وہ پاکستان کا سچے دل سے خیر خواہ رہیگا لیکن ریاست کے دستور کی وفاداری کا حلف وہ اس وقت تک نہیں لے سکتا جب تک کہ خود ریاست خدا کی وفاداری اور اس کے رسول کی اطاعت کا حلف نہ لے لے۔ اس کے بغیر جو حلف ایک غیر اسلامی بلکہ خلاف اسلام دستور کی وفاداری کا لیا جائے گا وہ صریح طور پر اس بنیادی حلف سے متصادم ہوگا جو ایک مسلمان نے پہلے ہی کلمۂ توحید و رسالت پڑھ کر لے رکھا ہے۔

ہمارے نزدیک جن لوگوں نے حکومت کو اس مرحلے پر اپنے ملازموں سے یہ حلف لینے کا مشورہ دیا ہے انہوں نے حکومت کی خیر خواہی نہیں کی ہے۔ اس وقت ملک کا آئندہ دستور زیر تجویز ہے۔ سابق دستور جس پر سردست حکومت کا نظام چل رہا ہے محض ایک عارضی چیز ہے جس کے حق میں زیادہ سے زیادہ بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ اسے بضرورت محض اس وقت تک برقرار رکھا گیا ہے جب تک نیا دستور نہ بن جائے۔ اس عارضی دستور سے کوئی شخص بھی مطمئن نہیں ہے اور دستور ساز اسمبلی کا قیام خود ہی یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس دستور کو بدلنے کی ضرورت سب کو تسلیم ہے۔ پھر آخر وہ کون عقلمند تھا جس نے حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اس عبوری دور میں اپنے ملازموں سے ایک ایسے دستور کی وفاداری کا حلف طلب کرے جسے کوئی بھی برحق

نہیں مانتا اور جسے صرف اس لئے قائم رکھا گیا ہے کہ نیا دستور بننے تک نظام حکومت کا ڈھانچہ حسب سابق برقرار رہے۔ حکومت کے ملازمین بہرحال ایک مشین کے بے جان پرزے نہیں ہیں۔ وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں ضمیر اور شعور رکھتے ہیں عقل اور رائے رکھتے ہیں سابق نظام کو بدلنے کی ضرورت کا جو احساس ان کی ساری قوم میں عام طور پر پایا جاتا ہے اس میں وہ بھی شریک ہیں آپ ان سے یہ ہرگز توقع نہیں کر سکتے کہ ضابطۂ ملازمت میں آپ جو چیز بھی رکھ دینگے اس کے مطابق ان کا ضمیر بیک وقت ڈھل جائیگا۔ ان کے ضمیر کا سرچشمہ آپ کا ضابطۂ ملازمت نہیں ہے بلکہ ان کے اپنے حسیات ہی ہیں۔ آپ جائز طور پر ان سے صرف اسی چیز کا حلف لے سکتے ہیں جو درحقیقت ان کے اپنے ضمیر کے مطابق ہو۔ ان کے ان حسیات کو نظر انداز کر کے اگر کوئی حلف نامہ آپ تصنیف کریں گے تو وہ ان کے اندر مصنوعی طور پر ایک نیا ضمیر پیدا نہیں کر دیگا بلکہ ایسے حلف نامے کو شرط ملازمت قرار دینے کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ ملازمین کی ایک کثیر تعداد محض روٹی کی خاطر تقیہ کے ساتھ یہ حلف لیگی درآنحالیکہ یہ ان کے ضمیر کی آواز نہ ہوگی۔ اور ایک بہت قلیل تعداد سچے دل سے اس پر دستخط کریگی کیونکہ اس کے اپنے نظریات بھی وہی کچھ ہیں جن پر موجودہ بے دین دستور مبنی ہے اور ایک دوسری قلیل تعداد اپنے ضمیر کے خلاف حلف لینے کی نسبت ملازمت چھوڑ دینا زیادہ پسند کریگی حالانکہ وہی اس حکومت کے سب سے زیادہ قابل قدر اور قابل اعتماد ملازم ہیں

کیا اس غیر دانشمندانہ طریق عمل کے بجائے زیادہ بہتر یہ نہ تھا کہ اس موقع پر سرکاری ملازموں سے صرف دو چیزوں کا حلف لیا جاتا ایک یہ کہ وہ پاکستان کے سچے وفادار و خیر خواہ رہیں گے دوسرے یہ کہ وہ اپنے فرائض منصبی کو دیانت اور فرض شناسی کے ساتھ انجام دینگے؟ اس مضمون کا حلف اگر لیا جاتا تو وہ ہر مسلمان کے ضمیر کے مطابق ہوتا اور جن خرابیوں کی اصلاح کیلئے اس وقت حلف لینے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے ان کیلئے بھی یہ بالکل کافی ہوتا۔

جنگ کشمیر

پچھلے دنوں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ آپ نے پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ کشمیر میں جو جنگ ہو رہی ہے یہ جہاد نہیں ہے اور یہ کہ جب تک حکومت پاکستان باقاعدہ جہاد کا اعلان نہ کرے اس وقت تک یہ جنگ جہاد کی تعریف میں نہیں آسکتی۔ پھر قیم جماعت کی طرف سے اس کی جو تردید شائع ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ

آپ نے اپنی تقریر میں کشمیر کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا بلکہ کسی صحبت میں ایک کشمیری بزرگ کے استفسار پر آپ نے کہا تھا کہ اہل کشمیر اپنی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کیلئے جو جنگ کر رہے ہیں وہ بجائے خود تو جہاد کے حکم میں ہے۔ مگر پاکستان کے باشندوں کے لئے اس میں حصہ لینا اس وقت تک موزوں نہیں جب تک ان کی گورنمنٹ حکومت اور حکومت ہند کے درمیان معاہدانہ تعلقات قائم ہیں۔ اس تردید سے کسی حد تک آپ کی پوزیشن واضح تو ہو گئی ہے لیکن افسوس ہے کہ اس سے میری اور مجھ جیسے بہت سے لوگوں کی تسلی نہیں ہوئی۔ اول تو حکومت پاکستان نے حکومت ہند سے کشمیر کے معاملہ میں کوئی معاہدہ نہیں کیا ہے بلکہ وہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو تسلیم کرنے سے انکار کر چکی ہے اور اب اور بھی اسی مسئلے پر دونوں حکومتوں کی نزاع چل رہی ہے۔ عجیب بات ہے کہ حکومت ہند نے حکومت پاکستان کے ساتھ اپنے معاہدانہ تعلقات کا کوئی احترام نہیں کیا اور ان تعلقات کے باوجود جوناگڑھ میں کھلم کھلا معاندانہ اقدام کر چکی ہے تو ہم کیوں ان تعلقات کا احترام ملحوظ رکھیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال ہے کہ اگر ایک ملک کے باشندے سرحد پار کسی جنگ میں ایک فریق سے ہمدردی رکھتے ہوں اور بطور خود اس کی مدد کیلئے جائیں تو یہ معاہدانہ تعلقات کی خلاف ورزی نہیں ہے۔ خود حکومت پاکستان اس کی ذمہ داری سے اپنی برأت کا اظہار کر چکی ہے۔ بین الاقوامی قانون کی رو سے بھی یہ بالکل جائز ہے کہ ایک ملک کے باشندے کسی ایسی طاقت کے خلاف لڑنے کیلئے بطور خود رضاکار بن کر جائیں جو ان کے نزدیک ظالم ہو چاہے دونوں فریقوں سے یا کسی ایک فریق سے ان کے ملک کی حکومت کا معاہدۂ دوستی قائم ہو۔ ان وجوہ سے ہمیں آپ کی رائے درست نہیں معلوم ہوتی۔ اور ہمیں اس بات پر بھی حیرت ہے کہ اس موقع پر آپ نے ایک ایسے مسئلے پر جس کے متعلق مسلمانوں کے جذبات بہت نازک ہیں، اظہار رائے کیوں کیا۔ آپ اس وقت پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں جس میں مسلمانوں کی عام رائے تیزی کے ساتھ آپ کے موافق ہو رہی ہے۔ اس موقع پر آپ کا ایسے خیالات ظاہر کرنا جو مسلمانوں کو کبھی پسند نہیں آ سکتے آپ کے مقصد کیلئے نقصان دہ ہے؟

آپ نے جس بات کا سب سے آخر میں ذکر کیا ہے میں سب سے پہلے اسی کے متعلق اپنا مسلک صاف صاف واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ آئندہ کبھی آپ یا آپ کی طرح سوچنے والے دوسرے لوگ

مجھ سے کسی قسم کی غلط توقعات وابستہ نہ کریں۔ میرے لئے کسی مسئلے پر رائے قائم کرنے اور ظاہر کرنے میں یہ سوال سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ لوگوں کے جذبات اس معاملہ میں کیا ہیں اور لوگ کس چیز کو پسند یا ناپسند کرتے ہیں۔ میرے سامنے اصلی سوال صرف یہ ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں خدا اور رسول کی ہدایت کیا ہے اور خدا کو کیا چیز پسند اور کیا چیز ناپسند ہے پھر جب مجھے تحقیق سے یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق فلاں طرز عمل صحیح ہے اور اسی میں خدا کی خوشنودی ہے تو میں خود اس کو اختیار کرتا ہوں اور دوسروں کو اس کی پیروی کا مشورہ دیتا ہوں۔ اس تحقیق سے اگر کوئی چیز مجھے ہٹا سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہی سے یہ ثابت کر دیا جائے کہ میری تحقیق غلط ہے یہ ثابت ہو جانے کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی رائے پر اصرار کرنا میں گناہ عظیم سمجھتا ہوں لیکن اگر قرآن و سنت میں میری رائے کے خلاف کوئی ثبوت نہ ہو تو پھر یہ بات میری نگاہ میں قطعاً کوئی وزن نہیں رکھتی کہ فلاں معاملہ میں مسلمانوں کے جذبات نازک ہیں یا فلاں رائے کو مسلمان ناپسند کرتے ہیں اس لئے جو کچھ حق ہے وہ نہ ظاہر کیا جائے، بلکہ وہ بات کہی جائے جو مسلمانوں کی عام خواہش کے مطابق ہو۔ بلاشبہ میں اپنی قوم سے محبت رکھتا ہوں اور میرے دل میں ان کی خیرخواہی کا جذبہ ان کے کسی بڑے سے بڑے خیرخواہ سے کم نہیں ہے، لیکن میں ان کی بھلائی اسی میں پاتا ہوں کہ وہ اپنی خواہشات کی پیروی کے بجائے خدا اور رسول کے بتائے ہوئے طریقے کی پیروی کریں، اور میرے نزدیک اس سے بڑھ کر مسلمانوں کے ساتھ خیانت اور بدخواہی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ آدمی حق گوئی کے بجائے پبلک کی رضاجوئی کو اپنا مسلک بنا لے۔ اس قسم کے بہت سے مفتی، لیڈر، مقرر اور محرر پہلے سے مسلمانوں کے پاس موجود ہیں جو ان کی خواہشات نفس کو تسلی دینے والی باتیں کہنے اور لکھنے کے لئے تیار ہیں۔ میں بہرحال اپنے آپ کو اس زمرے میں شامل نہیں کر سکتا مجھے قوم کی خوشنودی سے بڑھ کر خدا کی خوشنودی عزیز ہے۔ اگر قوم اس راہ پر چلنا چاہے جس میں خدا کی خوشنودی ہے تو میں اس کی خدمت کے لئے حاضر ہوں ورنہ میں خدا کی خوشنودی کے پیچھے چلتا رہوں گا اور قوم کو اختیار ہے جدھر چاہے جائے۔ آپ کا یہ ارشاد بھی نظرثانی کا محتاج ہے کہ میرا یہ طرز عمل اس مقصد کے لئے نقصان دہ ہے جس کے لئے میں جدوجہد کر رہا ہوں یعنی اسلامی نظام حکومت کا قیام

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس مقصد کے لئے یہی طرزِ عمل انسب اور اولیٰ ہے۔ آخر اسلامی آئین کے معنی ہی کیا ہیں اگر اس کی بنیاد یہ اصول نہ ہو کہ ملک کی داخلی سیاست اور خارجی پالیسی کے معاملہ میں اتباع صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا ہوگا نہ کہ قومی خواہشات اور دنیوی مصلحتوں کا۔ پس یہی میرے مسلک کے مطابق ہے کہ میں صرف انہی لوگوں کو اپنے ساتھ لوں اور انہی پر اعتماد کروں جو خدا و رسول کے آگے جھک جانے کے لئے تیار ہوں۔ ورنہ ایسی رائے عام کی تائید میرے لئے ذرّہ بھی مفید نہیں ہے جو نعرہ تو اسلامی حکومت کا لگائے مگر جب اس کی خواہشات کے خلاف کوئی حکم اسے سنایا جائے تو وہ اس پر صرف چیں بجبیں ہی نہ ہو بلکہ کہنے والے پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ شروع کر دے۔

اب میں آپ کے اصل سوالات کا جواب عرض کرتا ہوں۔

میں نے جنگ کشمیر کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ دراصل قرآن مجید کے ایک صریح حکم پر مبنی ہے۔ سورۂ انفال رکوع ۱۰ میں ارشاد ہوا ہے:—

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن
وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا وَإِنِ
اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ
إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ
وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

اور جو لوگ ایمان تو لائے ہیں مگر ہجرت کرکے
تمہارے پاس آگئے ان کی ولایت کا کوئی تعلق تم
جب تک کہ وہ ہجرت کرکے نہ آجائیں۔ البتہ اگر وہ
معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو مدد کرنا تم پر واجب
مگر کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس کے اور تمہا
درمیان معاہدہ ہو۔ اللہ دیکھتا ہے جو کچھ تم

اس آیت میں یہ بات بالکل صاف کر دی گئی ہے کہ اگر ہماری سرحد کے باہر کسی مسلمان آبادی پر ظلم ہو اور وہ ہم سے مدد مانگے تو ہم صرف اسی صورت میں مدد کو جا سکتے ہیں جبکہ ظلم کرنے والی قوم سے ہمارے (قومی حیثیت سے) معاہدانہ تعلقات نہ ہوں لیکن اگر ظالم قوم کے ساتھ ہمارا معاہدہ ہو تو ہمارا دل خواہ اپنے مظلوم بھائیوں کی مصیبت پر کتنا ہی کڑھتا ہو ہم ان کی حمایت میں انفرادی یا اجتماعی طور پر کوئی جنگی کاروائی نہیں کرسکتے۔

ہا یہ سوال کہ اس ظالم قوم نے ہمارے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں کی پابندی نہیں کی ہے تو ہم کیوں اس کے معاملہ میں معاہدہ کا احترام ملحوظ رکھیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے یہ سیاسی اخلاق ہمیں نہیں سکھایا ہے۔ یہ اخلاق ایک کافر قوم کے لئے زیبا ہو تو ہو مگر ایک مسلم قوم کے لئے ہرگز زیبا نہیں ہے کہ ظاہر میں معاہدہ قائم ہو دوستانہ باتیں ہو رہی ہوں اور در پردہ ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ کارروائیاں جاری رہیں۔ یہ یورپ کی ملعون ڈپلومیسی ہے جسے ہم ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ یا تو کسی قوم سے معاہدہ نہ کرو، یا اگر معاہدہ کرتے ہو تو پھر پوری ایمانداری کے ساتھ اس کی پابندی کرو۔ اور جب دیکھو کہ فریق ثانی اپنے معاہدوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو اس کا معاہدہ کھلم کھلا اس کے منہ پر مار دو، پھر تم آزاد ہو کر اس کے خلاف جو کارروائی کرنا چاہو کرو۔

وَ إِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَآءٍ ، إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ	اور اگر کسی قوم سے تم کو خیانت کا اندیشہ ہو تو برابری کے ساتھ ان کا عہد ان کی طرف پھینک دو (یعنی اس طرح کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ تمہارا اور ان کا معاہدہ باقی نہیں رہا ہے) حقیقت یہ ہے کہ
(الانفال - ۸)	اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔

آپ کا یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے کہ حکومتوں کے باہمی معاہدات کے باوجود ملک کے افراد اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق سرحد پار کی کسی جنگ میں رضاکارانہ حصہ لے سکتے ہیں۔ آپ اس طرز عمل کے لئے بین الاقوامی دستور کو حجت میں پیش کرتے ہیں مگر ہمارا کام دنیا کے کسی بین الاقوامی دستور کی پیروی کرنا نہیں ہے بلکہ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمیں صرف قرآن کے قانون کی پیروی کرنی چاہئے۔ قرآن کی رُو سے ہمارے ہر ہر فرد پر ان معاہدات کی پابندی واجب ہے جو ہم نے قومی حیثیت سے کسی کے ساتھ کئے ہوں۔ اس اخلاقی ذمہ داری سے اگر ہم بری الذمہ ہو سکتے ہیں تو صرف اس صورت میں جبکہ حکومت قوم کی نمائندہ نہ رہے۔ اس وقت ہم یہ اعلان کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہم ایسی حکومت کے کئے ہوئے معاہدات کے پابند نہیں ہیں۔

آپ کا یہ بیان امر واقعہ کی حد تک بالکل درست ہے کہ کشمیر کے معاملہ میں حکومت ہند اور حکومت پاکستان کے

کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے بلکہ یہ معاملہ ان کے درمیان ایک مابہ النزاع ہے اور حکومت پاکستان انڈین یونین کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو تسلیم کرنے سے انکار کر چکی ہے لیکن اس امر واقعہ سے آپ کا یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ ہم کشمیر میں جنگی کارروائی کرنے کے لئے آزاد ہیں۔ دو قوموں کے درمیان چند معاملات میں معاہدانہ تعلق اور ایک یا دو معاملوں میں حالت جنگ کا قیام ایک ایسی متناقض بات ہے جس کا کوئی معقول آدمی تصور نہیں کر سکتا۔ معاہدانہ تعلقات خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں، بہرحال اس امر کو مستلزم ہیں کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے خلاف جنگی کارروائی نہیں کریں گی۔ کسی امر میں اگر ان کے باہم نزاع ہو تو جب تک معاہدانہ تعلقات قائم ہیں، اس نزاع کو پرامن طریقے سے ہی سلجھانے کی کوشش کی جائے گی، اور اگر وہ کسی طرح نہ سلجھ سکے تو جنگ کا فیصلہ کرنے سے پہلے ان تمام دوستانہ تعلقات کو ختم کرنا ہوگا جو ان کے درمیان قائم تھے۔ لہٰذا اگر قومی حیثیت سے ہماری یہ رائے ہے کہ کشمیر کے معاملہ کی نزاکت ہمارے لئے حد برداشت سے متجاوز ہو چکی ہے اور یہ معاملہ ہمارے لئے اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ ہمیں اس کی خاطر جنگ کرنی چاہیئے تو بجائے اس کے کہ ہم اخلاقی اور شرعی حدود کو توڑ کر بے قاعدہ جنگی کارروائیاں کریں، ہم کو اپنی حکومت پر زور دینا چاہیئے کہ وہ حکومت ہند کے ساتھ اپنے معاہدانہ تعلقات ختم کر کے کشمیر کے معاملہ میں کھلم کھلا فوجی مداخلت کرے۔ صرف یہی وہ سیدھا اور صاف طرز عمل ہے جو ایک مسلم قوم ہونے کی حیثیت سے ہم اپنے دین کے مطابق اختیار کر سکتے ہیں۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اس موقع پر کشمیر کے معاملہ میں تمہارے اس اظہار رائے کی ضرورت ہی کیا تھی لیکن درحقیقت اس سوال کا جواب میرے ذمہ نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے ذمہ ہے جنہوں نے اصرار کر کے ایک پرائیویٹ صحبت میں مجھ سے اس مسئلے پر استفسار کیا اور پھر میرے جواب کو مسخ کر کے بلا ضرورت اخبارات میں اچھالا۔ اگر میں نے بطور خود پبلک میں کوئی بیان دیا ہوتا اور اسے شائع کرنے کی کوشش کی ہوتی تو البتہ آپ مجھ سے شکایت کر سکتے تھے۔

اس ڈرامے کی مرکزی اداکار کانگریس تھی اور داس نے جو پارٹ ادا کیا وہ احمقوں کے سوا کسی سے ادا نہیں ہو سکتا۔ تقسیم ہند سے دو تین برس پہلے ہی یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ اب تقسیم کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اسکے دو راستے کھلے ہوئے تھے۔ ایک راستہ یہ تھا کہ تلخی اور بدمزگی کے بڑھنے سے پہلے ہی اس چیز کو سیدھی طرح قبول کیا جاتا جو ناگزیر ہو چکی تھی اور بھلے آدمیوں کی طرح بیٹھکر سارے معاملات ایسے طریقہ سے طے کر لئے جاتے کہ مل جانے یا کم از کم شریف ہمسایوں کی طرح رہنے کے مواقع باقی رہتے۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ "لڑ کے رہینگے" اور "ہرگز نہ دینگے" کے اس جھگڑے کو انتہائی تلخی کی حد تک بڑھنے دیا جاتا اور اس ناگزیر تقسیم کو ایسے مرحلے پر پہنچ کر قبول کیا جاتا جہاں الگ ہونے والی قوموں کے درمیان دوستانہ تو درکنار شریفانہ انسانی تعلقات برقرار رہنے کے امکانات بھی ختم ہو جاتے۔ کانگریسی لیڈروں نے ان دونوں راستوں میں سے دوسرے راستے کو انتخاب کیا۔ اس کی وجہ اگر نادانی تھی تو بدقسمت ہے وہ قوم جو اپنی باگیں ایسے نادان لوگوں کے ہاتھ میں دے۔ اور اگر اس کی وجہ تھی کہ یہ لوگ اپنی قوم میں اپنی ہردلعزیزی کو کھونے کے لئے تیار نہ تھے تو یہ اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں نے اپنی پوزیشن کی خاطر ملک کو اس راستے پر جان بوجھ کر چلایا جس میں ان کے کروڑوں ہم وطنوں کی بربادی تھی۔

اس سارے کھیل میں کانگریس نے اپنے طرزِ عمل سے اپنے دشمنوں اور مخالفوں کی ایک ایک بات کو سچا اور اپنی ایک ایک بات کو جھوٹا کر کے دکھایا۔

ہندوستان کی آزادی کے خلاف چرچل اور دوسرے انگریز مدبرین کی سب سے زیادہ پرزور دلیل یہ تھی کہ ہمارے ہٹتے ہی ملک میں فساد عظیم برپا ہو جائیگا۔ کانگریسی لیڈر اس کے جواب میں کہتے تھے کہ یہ ایک بات ہے جو تم اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے بناتے ہو۔ ذرا ذمہ داری کا بوجھ اہل ملک پر ڈال تو دو پھر دیکھو کہ کیسا امن اور انصاف قائم ہوتا ہے۔ اب واقعات نے کسے سچا اور کسے جھوٹا ثابت کیا، یہ آج سارا زمانہ دیکھ رہا ہے۔

مسٹر جناح کا سب سے بڑا الزام کانگریس پر یہ تھا کہ وہ دراصل ایک متعصب ہندو قوم پرست جماعت ہے اور اس نے محض منافقت کے ساتھ ہندوستانی قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ کانگریسی اس الزام کو بالکل غلط کہتے تھے لیکن آزادی ملنے کی آمد کے بعد سے آج تک کانگریس اور اس کے لیڈروں نے جو کچھ کیا ہے وہ مسٹر جناح کے الزام کا ناقابل تردید

ثبوت ہے۔ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر سے اس لبادے کو تار پھینکا ہے جسے مسٹر جناح منافقت کا لبادہ کہتے تھے۔

کانگرس کے مخالفین کہتے تھے کہ جو سوراج کانگرس قائم کرنا چاہتی ہے وہ دراصل ہندو راج ہوگا جس میں مسلمانوں کے لئے کوئی آزادی نہ ہوگی۔ اسی اندیشے پر تقسیم ملک کی تجویز مبنی تھی اور اسی خطرے کی بنا پر مسلمانوں کی عظیم اکثریت اس تحریکِ آزادی کو مشتبہ نظروں سے دیکھتی تھی جس کی علمبرداری کا "شرف" کانگرس کو حاصل تھا۔ کانگرسی لیڈر ہمیشہ مسلمانوں کے ان اندیشوں اور خطرات کو بے بنیاد قرار دیتے رہے۔ مگر ۱۵ اگست کے بعد جو کچھ ہندوستان میں ہوا اور اب تک ہو رہا ہے اس نے ان سارے اندیشوں کو بالکل صحیح ثابت کر دیا جن کی بنا پر مسلمان کانگرس کی تحریکِ آزادی کو اپنے لئے تحریکِ بربادی سمجھتے تھے۔ بلکہ درحقیقت سوراج قائم ہوتے ہی جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ شروع ہوا وہ تو ان بدتر سے بدتر اندازوں سے بھی بدرجہا زیادہ بدتر نکلا جو کانگرس کے شدید ترین مخالف کر سکتے تھے۔

کانگرس کا دعوٰی تھا کہ وہ ہندوستان کی وحدت کا عقیدہ رکھتی ہے اور تقسیم کو محض مسلم لیگ اور انگریزی حکومت کی زبردستی سے با دلِ ناخواستہ قبول کر رہی ہے لیکن تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے وقت اور تقسیم کے بعد جو کچھ اس نے کیا وہ سب اس تقسیم کو دائمی اور ابدی بنا دینے والا ہے۔ اگر آدمیت سے تقسیم کا معاملہ طے کیا جاتا، شرافت سے اس پر عمل درآمد کیا جاتا اور اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں سے منصفانہ سلوک کیا جاتا تو بعید نہ تھا کہ کچھ مدت بعد پاکستان خود ہندوستان کے ساتھ اتحاد کا خواہشمند ہوتا مگر اب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان وہ دیواریں کھڑی ہو چکی ہیں جو صدیوں تک انہیں ایک دوسرے سے جدا رکھیں گی۔

اب تیسرے اداکار کو لیجئے جس کا پارٹ اس ڈرامے میں سب سے زیادہ ناکام رہا ہے۔

دس سال مسلمانوں کی قیادتِ عظمٰی جس لائحہ عمل پر چل رہی تھی وہ سلطان عبدالحمید خاں کی سیاست سے ملتا جلتا تھا جس طرح وہ ۳۳ سال تک محض دول یورپ کی باہمی رقابتوں سے فائدہ اٹھا کر جیتے رہے اور اس دوران میں خود ترکی کی کوئی طاقت انہوں نے نہ بنائی جس کے بل بوتے پر وہ جی سکتا، اسی طرح اس قیادت کا بھی سارا سیاسی کھیل بس انگریز اور کانگرس کی کشمکش سے فائدہ اٹھانے تک محدود تھا۔ پورے دس سال میں اس نے خود اپنی قوم کی اخلاقی، مادی اور تنظیمی طاقت بنانے اور اس کے اندر قابلِ اعتماد سیرت پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جس کی بنا پر وہ اپنے کسی مطالبہ کو خود اپنی طاقت

سے مٹ سکتی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جونہی انگریز اور کانگریس کی باہمی کشمکش ختم ہوئی، اس قیادتِ عظمیٰ نے اپنے آپ کو ایسی حالت میں پایا جیسے اس کے پاؤں تلے زمین نہ ہو۔ اب وہ مجبور ہوگئی کہ جو کچھ جن شرائط پر بھی ملے اسے غنیمت سمجھ کر قبول کرلے۔ بنگال و پنجاب کی تقسیم اسے بے چون و چرا ماننی پڑی۔ سرحدوں کی تعیین جیسے نازک مسئلے کو اسے صرف ایک شخص کے فیصلے پر چھوڑ دینا پڑا، انتقالِ اختیارات کے لیے جو وقت اور جو طریقہ تجویز کردیا گیا اسے بھی بلا تامل اس نے مان لیا۔ حالانکہ یہ تینوں امور صریح طور پر مسلمانوں کے حق میں مہلک تھے۔ انہی کی وجہ سے ایک کروڑ مسلمانوں پر تباہی نازل ہوئی، اور انہی کی وجہ سے پاکستان کی عمارت اول روز ہی سے سخت متزلزل بنیادوں پر اٹھی۔

اس قیادت کی غلطیاں اتنی بہت زیادہ ہیں کہ چند سطروں میں انہیں شمار کیا جاسکے۔ مگر اس کی چند غلطیاں تو اتنی نمایاں ہیں کہ آج ہر ذی ہوش آدمی ان کو بری طرح محسوس کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر:

۱۔ اس نے حصولِ پاکستان کی جنگ میں اُن علاقوں کے مسلمانوں کو شریک کیا جنہیں لامحالہ ہندوستان ہی میں رہنا تھا۔ آج یہی اس کا خمیازہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین اُن غریبوں کے لیے جہنم بن گئی ہے۔ حالانکہ اگر تقسیم کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کا مستقبل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو جانا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ تقسیم سے پہلے دونوں کی پالیسی ایک ہوتی۔

۲۔ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک ہفتہ پہلے بھی خبردار نہ کیا کہ تقسیم کے وقت اُن پر کیا طوفان ٹوٹنے والا ہے۔ اگر فی الواقع اسے ان حالات کا اندازہ ہی نہ تھا تو اس کی غفلت و بے خبری قابلِ ماتم ہے۔ اور اگر اس نے جان بوجھ کر مسلمانوں کو بے خبر رکھا تو اس غداری کے لیے اسے کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔ (۳) جن لیڈروں پر ہندوستان کے مسلمان آخر وقت تک اندھا اعتماد کیے ہوئے تھے وہ عین وقت پر انہیں چھوڑ کر پاکستان اٹھ آئے اور انہیں کچھ بھی نہ بتایا کہ ان کے پیچھے وہ کیا کریں۔ (۴) جو عجیب و غریب ہدایت ہندوستان کے مسلمانوں کو دی گئی وہ یہ تھی کہ ایک رات میں وہ اُن سارے اصولوں کو نگل جائیں جن پر وہ دس برس سے کانگریس کے خلاف اڑے ہوئے تھے۔ ۱۴ اگست کا سورج دو قومی نظریے کا کلمہ پڑھتے ہوئے غروب ہوا اور ۱۵ اگست کا سورج طلوع ہوتے ہی ہر ہندی مسلمان ہندوستانی قومیت کا معتقد بن کر اٹھے۔

(۵) پچھلے دس سال کی قومی تحریک میں اسلام کا نام جس قدر لیا گیا اس کا پچاسواں حصہ بھی مسلمانوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لیے کام نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کے قومی اخلاق کو پہلے سے کچھ زیادہ ہی پست کردیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ قومی جنگ میں مسلمان ان تمام اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوئے جن کا ارتکاب ان کے حریفوں نے کیا۔ مظالم کی مقدار میں چاہے کتنا ہی فرق رہا ہو مگر مظالم کی نوعیت میں دونوں کے کارنامے ایک دوسرے سے کچھ بھی مختلف نہ رہے۔ اگر ہماری قومی قیادت نے ہمارے عوام کی اخلاقی تربیت کے لیے کوئی کوشش کی ہوتی اور اکثریت کے علاقوں کے مسلمان وہ حرکات نہ کرتے جو انہوں نے کیں، تو اقلیت کے مسلمان اس بری طرح نہ پیسے جاتے، اور آج پاکستان کی اخلاقی پوزیشن ہندوستان سے اتنی زیادہ اونچی ہوتی کہ ہندوستان اس سے آنکھ ملا کر بات نہ کرسکتا۔

OUR ENGLISH LITERATURE :

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231–Price Rs. 3 8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi —This treatise deals with Nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72–Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64–Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56–Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & Its Islamic Solution** —By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56–Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56-Price As. 12

7. **What is Islam?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96–Price Re. 1 8

8. **After Secularism what?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56–Price As. 12

Can be had from:

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE

رسالۂ دینیات

رسالۂ دینیات یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں و لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اِس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مُسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اِسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اِس رسالہ کا مُطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علما بھی اِس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اِس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۸ محصولڈاک ۲ر خرچ وی پی ۳ر

TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM

BY

SAYYID ABUL-ALA MAUDUDI

This small book is an attempt at a clear and concise interpretation of Islam. The chief aim in view has been to present within a brief space the most systematic and logical conception of Islam to build a coherent and organic structure of human life on the basis of this conception and to give a comprehensive and lucid account of what this religion in reality is.

All the prominent journals and dailies of India have highly spoken of this little book. Order your copy just now. Price Rs. 3/8.

The Manager,

TARJUMANUL QURAN, LAHORE

سرورق زرین پریس لاہور میں چھپا